ماهنامہ
صراطِ مستقیم
برمنگھم
May 2021
BANNED
SWITZERLAND I
BURQA BAN

وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

صراطِ مستقیم برمنگھم

بیاد

مولانا فضل کریم عاصم رحمہ اللہ

مولانا محمود احمد میرپوری رحمہ اللہ

Vol: 41 No. 07 May 2021

Ramadan/ Shawwal 1442 AH

جلد: 41 شمارہ: 07 مئی 2021ء

رمضان، شوال 1442ھ

فہرست مضامین

Correspondence Address:

SIRAT-E-MUSTAQEEM

20 Green Lane, Small Heath,

Birmingham B9 5DB

Tel: 0121 773 0019

Fax: 0121 766 8779

ناشر: مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ

Markazi Jamiat Ahl-e-Hadith UK

www.mjah.org.uk/siratemustaqeem

E-mail: info@mjah.org.uk

(نوٹ: ادارہ کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں)

اس وقت عالمی میڈیا پر انسانی حقوق کی پامالی کے حوالے سے شہ سرخیوں میں جگہ پانے والے ممالک میں چین سر فہرست ہے۔ جس نے مقامی مسلمانوں کا جینا حرام کر رکھا ہے، جب کہ دیکھا جائے تو انسانی حقوق خصوصاً مسلمانوں کے بنیادی حقوق کی پامالی کے تعلق سے تشویشناک صورتحال چین یا برما تک محدود نہیں، بلکہ یورپ میں آباد مسلمان بھی کم و بیش اسلاموفوبیا کی شکل میں اس جیسی صورتحال سے دوچار ہیں۔

مگر بھلا ہو عالمی میڈیا کی دورخی پالیسی کا، کہ وہ یورپ کے حوالے سے پیش آنے والے واقعات کو چنداں اہمیت نہیں دیتا یا عمداً ایسی خبروں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ فرانس ہی کو لیجیے، موجودہ حکومت نے مقامی مسلمانوں کے خلاف ایک مہم شروع کر رکھی ہے۔ مسلمانوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کرنے کی غرض سے نت نئے قوانین متعارف کیے جارہے ہیں۔

آئے دن حکومتی اعلیٰ عہدیداران کے نسل پرستی پر مبنی بیانات عوام الناس میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور بغض وعداوت کو ہوادے رہے ہیں۔

یاد رہے کہ فرانس وہ ملک ہے جس کو یہ زعم ہے کہ انسانی حقوق کے تحفظ، جمہوری اقدار کے احترام اور قانون کی بالادستی کو عملی شکل دینے میں اس کو قائدانہ حیثیت حاصل ہے۔ دوسری جانب یہی ملک اظہار رائے کی آزادی کی آڑ میں اسلامی تقدس کی دھجیاں اڑا کر اینٹی مسلم گروپس کو تقویت پہنچارہا ہے۔

معاملہ صرف بیانات تک محدود نہیں، بلکہ عملی اقدامات اس کے مذموم ارادوں کو واضح کر رہے رہیں۔

چنانچہ گزشتہ چند ماہ میں کئی ایک حیلے اور بہانوں سے مساجد اور اسلامی اسکولز کو تالے لگائے جاچکے ہیں۔

مسلمانوں خصوصاً مساجد کمیٹیوں کے ارکان کو مزعومہ جمہوری انداز پر مبنی اس منشور کے مطابق مساجد اور مدارس کے نظام کو تشکیل دینے پر مجبور کیا جارہا ہے، جس کی متعدد شقیں سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ اور اس سے انکار کو قانون شکنی اور انتہاپسندی پر محمول کیا جارہا ہے۔

یہ وہ منشور ہے جس میں نسلی اور مذہبی امتیاز برتتے ہوئے صرف مسلم کمیونٹی کو نشانہ بنایا گیا ہے مثلاً اس منشور کی رو سے مسلمان والدین اپنے بچوں کو ہوم ایجوکیشن دینے سے محروم کر دیے جائیں گے جبکہ قانون ماں باپ کو چند ایک شرائط کی تکمیل پر اپنے بچوں کو اسکول کے بجائے گھر پر تعلیم دینے کا اختیار دیتا ہے، مسلمان خاتون صنفی بنیاد پر اپنے لیے لیڈی ڈاکٹر کا انتخاب نہیں کر سکے گی۔ ترکی، تیونس، مراکش اور الجزائر سے تعلق رکھنے والے علماء مسجد میں امامت وخطابت کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے۔ اس حوالے سے فرانس میں موجودہ 300 ائمہ مساجد کو ملک بدر کیے جانے والوں کی لسٹ پر رکھا جا چکا ہے۔ پبلک مقامات میں 18 سال سے کم عمر لڑکیوں پر اسکارف کا پہننا ممنوع، بچوں کو اسکول چھوڑنے اور اسکول سے لینے والی نیز بچوں کے حوالے سے کسی استفسار کی غرض سے اسکول کی عمارت میں داخل ہونے والی ماؤں پر اسکارف کا پہننا ممنوع، پرستی اور عصبیت پر مبنی ان جیسے قوانین کی ایک لمبی لسٹ ہے۔ جن کے ذریعہ مسلمانوں کی نئی نسل میں جمہوری اقدار کے نام پر بے دینی، بے راہ روی اور لادینیت کے جراثیم کی افزائش مقصود ہے۔ یہ صورت حال صرف فرانس کی حد تک محدود نہیں، بلکہ اسلاموفوبیا کی زہرناکی یورپ کے کئی اور ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ چنانچہ ایک ماہ قبل سوئزرلینڈ کی حکومت کی جانب سے عوامی ریفرنڈم کے بعد برقعہ اور نقاب پر پابندی لگادی گئی۔

برقعہ اور نقاب کے خلاف عوامی ریفرنڈم کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوئزرلینڈ میں مسلمانوں کے خلاف فضا کو کس قدر مسموم کیا جاچکا ہے۔

گزشتہ سال ہالینڈ میں دائیں بازو سے تعلق رکھنے والی جماعتوں کی جانب سے Burqa Ban کی تحریک چلائی گئی اور حکومت نے ان کے دباؤ میں آ کر ملک میں نقاب پر پابندی لگا دی اور قانون کی خلاف ورزی پر 150 ڈالر جرمانے کا بھی اعلان کر دیا۔

چند ماہ قبل یونان میں عیسائی طبقہ کے اعلیٰ ترین ذمہ دار آرچ بشپ نے اسلام کو آسمانی دین ماننے سے انکار کر دیا اور برملا اسلام کو ایک سیاسی تحریک قرار دیتے ہوئے اس کو ماننے والوں کو جنگجو قوم کہہ دیا اس کا کہنا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں سے انسانیت کے حق میں کسی بھی فائدے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح آئے دن جرمنی، سویڈن، ڈنمارک میں مساجد پر اشرار کے حملوں میں اضافہ معمول کی کارروائی بنتا جارہا ہے۔

الغرض یورپ میں مسلمانوں کے خلاف اسلاموفوبیا کا بڑھتا ہوا سیلاب قرون وسطی کی تلخ یادوں کو تازہ کررہا ہے۔ جب یورپ میں یہ کہاوت

زبان زد خاص وعام تھی کہ "تمہارے یورپین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تم مسلمان نہیں ہو۔"
افسوسناک امر یہ ہے کہ یورپ کی مسلم قیادت ان تمام تلخ حقائق کا صحیح ادراک کرنے سے ابھی تک قاصر ہے۔ خطرات سر پر منڈلا رہے ہیں۔ مگر ہماری مسلم قیادت سمجھتی ہے کہ یورپ میں اسلام آزاد ہے، علامہ اقبال نے کسی وقت ہند کی مثال دیتے ہوئے کہا تھا کہ

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

آج یہ شعر ہم پر پوری طرح صادق آرہاہے۔
یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ اس وقت مسلمان اور مساجد یورپ کا جزء لاینفک بن چکے ہیں یعنی مساجد بھی رہیں گی اور مسلمان بھی، مگر جس رفتار سے یورپ میں مسلمانوں کی نئی نسل کے اسلام سے اٹوٹ رشتہ کو کمزور کرنے کی کوششیں جارہی ہیں، عین ممکن ہے کہ مساجد رہیں گی مگر ویران، مسلمان بھی رہیں گے مگر اسلام سے نالاں، ان پر یورپین یالبرل اسلام کو تھوپ دیا جائے گا۔
لہٰذا کیا یہ دانش مندی نہیں کہ آنے والے فتنوں کا سدباب کرنے کے لیے ابھی منصوبہ بندی کر لی جائے۔ بیدار قومیں صرف محض حال میں نہیں جیتیں بلکہ ان کے پیش نظر ہمیشہ ایک محفوظ مستقبل کی تشکیل بھی ہوتی ہے۔

ہندی اِسلام

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملّت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوّتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد
اے مردِ خدا! تجھ کو وہ قوّت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکینی و محکومی و نومیدیِ جاوید
جس کا یہ تصّوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

"دینی تعلیمات کو درست انداز میں سمجھنے کے لیے مؤثر ذرائع اور اہم مصادر تین ہیں۔ قرآن مجید، سنت اور منہج سلف صالحین۔ کچھ لوگ قرآن وسنت کی بسا اوقات بات تو کرتے ہیں لیکن سلف صالحین کے منہج سے اعراض کرتے ہیں یا اس کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہیں، حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے زمانہ کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین زمانہ قرار دیا ہے، جن کی ایمان وعقیدہ میں پختگی، دینی علوم میں مہارت، عمل کا جذبہ اور دین پر ثابت قدمی اپنی مثال آپ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد اور فیض یافتگان تھے، ان کے سامنے قرآن مجید نازل ہو رہا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بنفس نفیس شرعی احکام ان کے سامنے بیان فرمار ہے تھے۔
ان گرامی قدر ہستیوں سے زیادہ دینی احکام ومسائل اور پس منظر دوسرے کیسے سمجھ سکتے ہیں، لہٰذا شرعی علوم اور دینی مسائل کو سمجھنے کے لیے منہج سلف صالحین کو خصوصی حیثیت حاصل ہے ورنہ تباہی ہو گی جیسے ماضی میں مختلف فرقے اور گروہ جادۂ حق سے دور ہوئے اور صراط مستقیم سے بھٹک گئے اور آج بھی اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ دین فہمی اور روشن خیالی کے نام پر کس طرح بے دینی پھیل رہی ہے اور شرعی احکام ومسائل لوگ اپنے ذہنی سانچے کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔
وزارت مذہبی امور سعودی عرب کی لندن آفس کے سربراہ الشیخ الدکتور محمد احمد الفقیہی حفظہ اللہ نے اہل علم کی ایک نشست سے منہج سلف کی اہمیت پر مؤثر خطاب کیا۔ افادۂ عام کی خاطر ترجمہ ہدیہ قارئین ہے۔"

قرآن وسنت پر عمل منہج سلف صالحین کے مطابق کرنا واجب ہے، کچھ دلائل درج ذیل ہیں:

1۔ پہلی دلیل: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ﴾(سورۃ التوبۃ:100)

"مہاجر اور انصار جنہوں نے اسلام قبول کرنے میں پہل اور سبقت کی اور جو اخلاص کے ساتھ ان کی پیروی کرنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اللہ سے راضی ہوئے۔"

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت کا آخری حصہ اخلاص کے ساتھ پیروی کرنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں، ان کے اوصاف حمیدہ کو اپناتے ہیں اور ہر دم خفیہ اور برملا اسی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

علامہ سعدی رحمہ اللہ نے فرمایا: اس کا مطلب ان کی پیروی عقائد، اقوال اور اعمال میں کرنی ہو گی، اور ایسے ہی لوگ برائی سے محفوظ رہیں گے اور ان ہی کے لیے حقیقی تعریف اور اللہ کی طرف سے بہترین نوازش ہو گی۔

علامہ شیخ العثیمین رحمہ اللہ نے مشہور پروگرام 'نور علی الدرب' میں فرمایا، اتباع بالاحسان کا لازمی تقاضا ہے کہ ان کی پیروی کرنے میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی نہ ہونے پائے اور مزید فرمایا، ہمارے لیے ضروری ہے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرز عمل تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان گرامی قدر ہستیوں کا جو طرز عمل رہا، اس کی طرف ہم رجوع کریں، کیونکہ ان کا دور سب سے بہترین اور افضل دور تھا۔ ہمارے لیے درست نہیں کہ دینی امور میں کوئی ایسی بات یا کام شروع کریں جو اس عہد مبارک میں نہیں تھا ورنہ یہ بدعت ہے جو اللہ عزوجل سے دوری کا سبب بن جائے گی۔ دین میں نئے کام سے اللہ کی پناہ، کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔ حق کے واضح ہو جانے کے بعد سوائے گمراہی کے اور کچھ نہیں۔

علامہ الشیخ صالح الفوزان نے مذکورہ آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اخلاص کے ساتھ ان کی پیروی کرنے والوں سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اس صفت سے متصف ہو گا قیامت تک، لہٰذا امت کے تمام افراد کے لیے ضروری ہے کہ مہاجر اور انصار صحابہ کے منہج پر چلیں۔ امام مالک نے ارشاد فرمایا کہ اس امت کے آخر میں آنے والوں کے لیے بھی وہی بات اور راستہ درست ہو گا جو اگلوں کے سامنے تھا یعنی اگلوں کے مسائل کا جو حل تھا وہی بعد میں آنے والوں کے لیے بھی ہو گا۔

جو شخص چاہتا ہے کہ امت کا تعلق اپنے درخشاں ماضی سے منقطع ہو، وہ سلف صالحین کے راستہ کو چھوڑ دے، یقین جانیے کہ ایسا شخص امت مسلمہ کو اور نقصان پہنچانے کے درپے ہے بلکہ دین اسلام میں تبدیلی چاہتا ہے، اس کی کوشش ہے کہ بدعات اور خرافات کو پروان چڑھائے۔ ان کوششوں کو مسترد کر دینا چاہیے، اس کی بیخ کنی کرتے ہوئے اس شرانگیزی سے دوسروں کو متنبہ کرنا ہو گا۔ کیونکہ سلف صالحین کے منہج اور طرز عمل کو اپنانا اور پیروی کرنا ضروری ہے، یہ دراصل حکم ربانی ہے اور یہی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہے۔

آیت مذکورہ میں یہ نکتہ نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی کو مشروط کر دیا ہے کہ سابقین کی اخلاص کے ساتھ پیروی کی جائے، اسی میں اجر وثواب رکھا ہے اور اسی حسن عمل کا

بہترین بدلہ رکھا ہے۔ اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ جو اخلاص کے ساتھ ان اگلوں کی پیروی نہ کرے، اس کے لیے سزا اور رضائے الٰہی سے محرومی ہوگی۔

2۔ دوسری دلیل: اللہ عزوجل کا فرمان ہے:

﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا﴾

"کہ اگر وہ تم جیسا ایمان لائیں تو ہدایت پائیں گے۔" (سورۃ البقرہ:137)

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: اگر وہ لوگ ایمان لائیں یعنی کفار، اہل کتاب وغیرہ جس طرح اے مؤمنو تم ایمان لائے ہو، اللہ کی نازل کردہ تمام کتابوں پر، رسولوں پر اور ان میں تفریق نہ کریں تو وہ ہدایت یافتہ ہوں گے اور حق کو پائیں گے۔"

علامہ سعدی رحمہ اللہ نے فرمایا: "اے ایمان والو! یعنی جو ایمان لے آئے تمام رسولوں پر، کتابوں پر اور ان سب میں اعلیٰ اور افضل محمد ﷺ اور قرآن مجید ہے۔ اللہ کی توحید پر ان کا ایمان ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسولوں میں تفریق نہیں کرتے تو ایسے ہی لوگ صراط مستقیم پر گامزن ہیں، یہی وہ راستہ ہے جو جنت اور اس کی نعمتوں کی طرف لے جاتا ہے یعنی صراط مستقیم پر چلے بغیر وہ ہدایت یافتہ نہیں ہوسکتے۔"

علامہ الشیخ العثیمین رحمہ اللہ نے مذکورہ آیت کے فوائد میں یہ بات لکھی ہے کہ ہر وہ چیز جو رسول اکرم ﷺ کے راستہ کے خلاف ہو وہ گمراہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کے ہدایت یافتہ ہونے کے لیے لازم کر رکھا ہے کہ ان مذکورہ باتوں پر اسی طرح اسے ایمان لانا ہوگا جیسے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب نے ایمان لائے۔

اس کا مفہوم مخالف یہ ہوگا کہ جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ جیسا ایمان نہ لائے تو وہ ضلالت اور گمراہی میں ہوگا۔

3۔ تیسری دلیل: فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾

(سورۃ النساء:115)

" اور جو شخص بھی راہ ہدایت کے واضح ہو جانے کے باوجود رسول کے خلاف کرے اور مؤمنوں کی راہ چھوڑ کر چلے ہم اسے اسی طرف موڑ دیں گے جدھر وہ خود متوجہ ہوا اور اسے دوزخ میں ڈال دیں گے جو کہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔"

علامہ ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ "سیدنا عمر بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ سے جو سنت ثابت ہے اور آپ ﷺ کے بعد ذمہ داروں نے جو طریقہ اختیار کیا، اس کو قبول کرنا یہ گویا اللہ کی کتاب کی تصدیق، اللہ کی اطاعت اور دین میں پختگی کا سبب ہے۔ کسی بھی شخص کے لیے سزاوار نہیں کہ اس میں کوئی ترمیم اور ردوبدل کرے جو بھی اس راہ ہدایت پر عمل کرے وہی ہدایت یافتہ ہے جو اس پر ثابت قدم رہے وہی کامیاب ہوگا اور جو اس راستہ کی مخالفت کرکے غیر مسلموں کا راستہ اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے اسی کے اختیار کردہ راستہ کی طرف موڑدے گا اور اسے جہنم میں داخل کرے گا جو کہ برا ٹھکانہ ہے۔"

علامہ سعدی نے فرمایا: جو کوئی رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرے اور اس کے خلاف عناد اختیار کرے خصوصاً حق کے واضح ہو جانے کے بعد قرآنی دلائل اور صریح نبوی ہدایت کے برعکس اور غیر مسلموں کی اتباع اختیار کرے، یعنی ان کا طریقہ اپنائے چاہے عقائد میں یا اعمال میں تو ہم اسے اسی حال پر چھوڑ دیں گے جو خود اس نے اختیار کیا ہے۔ پھر خیر کی توفیق نہیں دی جائے گی کیونکہ اس نے حق کو جاننے اور سمجھنے کے بعد اسے چھوڑ دیا، لہٰذا یہ عدل الٰہی کا تقاضہ ہے کہ اسے اس کی اختیار کردہ گمراہی پر ہی رہنے دیا جائے۔

علامہ الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو صحابہ کی مخالفت کرے اور ان کے نقش قدم پر نہ چلے اور نہ ہی اخلاص کے ساتھ ان کی پیروی کرے، اس کا شمار کامیاب لوگوں میں نہیں ہوگا، بعد میں آنے والوں کے لیے درست نہیں کہ اگلے علماء کی مخالفت کریں۔ اجماع برحق ہے، دین فہمی کے تین بنیادی اصولوں میں سے ایک اجماع ہے جس کی مخالفت جائز نہیں، قرآن وسنت اور اجماع جب علماء کا کسی مسئلہ میں اجماع ثابت ہو جائے پھر وہی طائفہ منصورہ کہلائے گا یعنی ایسا گروہ جو نصرتِ الٰہی کا مستحق اور کامیابی کا حقدار ہے، جس کی رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ ایک جماعت ہر دم اور ہر وقت حق پر قائم رہے گی۔

علامہ الشیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے 'فتنۃ التکفیر' میں فرمایا کہ آیت مذکورہ میں سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب داخل ہیں، ان ہی کا راستہ مؤمنین کا راستہ کہلاتا ہے، لہٰذا مسلمانوں کے لیے عومی طور پر اور داعیان دین کے لیے خصوصی طور پر یہ درست نہیں کہ وہ قرآن وسنت کا صحیح فہم حاصل کرنے کے لیے آج کل جو متداول طریقہ اور وسائل ہیں جیسے عربی زبان میں مہارت، ناسخ ومنسوخ کی معرفت وغیرہ وغیرہ، اسی پر اکتفاء کریں، بلکہ سب سے پہلے فہم صحابہ کو دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے فلاں مسئلہ کو کیسے سمجھا، اس لیے کہ ان کے آثار اور ان کی سیرت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی عبادت میں زیادہ مخلص اور قرآن وسنت کی زیادہ سمجھ رکھتے تھے اور ایسی ہی متعدد عمدہ صفات اور اعلیٰ اخلاق سے وہ متصف تھے۔

میں کہتا ہوں کہ اس دور میں جس کا حوالہ آیت مذکور میں ہے، مؤمن صرف رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ ہی تھے۔

4۔ چوتھی دلیل: فرمان نبوی ﷺ ہے کہ سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ بہترین

زمانہ وہ میرا زمانہ ہے، پھر جو اس کے متصل بعد پھر اس کے متصل بعد۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے اس بہترین زمانہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت جو قرآن مجید کے ماہر تھے، خلفاء اربعہ کے دور کے ساتھ ہی یہ اعلیٰ ترین دور ختم ہوا، حتیٰ کہ ان کے بعد بدری صحابہ کی اکثریت ختم ہو چکی تھی، پھر اصاغر صحابہ اور اکابر تابعین کا زمانہ تھا جو سیدنا عبد اللہ بن زبیر اور عبد الملک کے دور میں تھے، پھر تابعین کی اکثریت اموی دور حکومت کے اواخر اور عباسی دور حکمت کے آغاز میں تھی۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ: 10/357)

علامہ بربہاری نے شرح السنہ میں ذکر کیا ہے کہ الجماعت سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، ان ہی پر صحیح معنوں میں اہل سنت والجماعہ کا اطلاق ہو گا۔ جو ان کے راستہ پر قائم نہ رہے اور ان سے رہنمائی حاصل نہ کرے وہ گمراہ اور بدعتی ہو گا اور یہ بات طے شدہ ہے کہ ہر بدعت ضلالت ہے اور ضلالت کا ٹھکانہ جہنم میں ہو گا۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ نے منہاج السنہ میں فرمایا: "جس طرح کوئی زمانہ دور صحابہ سے زیادہ مکمل اور بھرپور نہیں ہے اسی طرح صحابہ کے بعد بہتر عہد عہد تابعین ہے، پھر جو بھی حدیث، سنت اور صحابہ کی پیروی کرے گا وہ بہتر سمجھا جائے گا، وہی گروہ اول سب سے ممتاز تھا جو ہدایت یافتہ، اللہ کی رسی مضبوطی سے پکڑے ہوئے اور فرقہ واریت اختلافات اور فتنوں سے دور تھے اور پھر جو بھی اس بہترین دور سے جتنا دور ہوتا گیا وہ رحمت سے دور اور فتنوں سے قریب ہوتا گیا۔

علامہ الشیخ عثیمین نے 'نور علی الدرب' میں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ فرمان امت کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ اس دور کی روش اپنائیں جو کہ بہترین دور شمار ہوتا ہے۔ (منہاج السنہ: 6/368)

5۔ پانچویں دلیل: سیدنا عرباض رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا کر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ہمیں نصیحت فرمائی وہ کچھ ایسی مؤثر نصیحت تھی کہ ہماری آنکھیں اشکبار ہو گئیں، دل خوفزدہ ہو گئے حتیٰ کہ کسی نے کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی رخصت کرنے والے کی نصیحت ہے۔ آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ سمع وطاعت کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرو، چاہے ایک حبشی غلام کی ہی بات ہو، کیونکہ میرے بعد تم میں سے جو زندہ رہے گا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا، لہٰذا تم میری سنت کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور خلفاء راشدین کی سنت کو اپناؤ قوت کے ساتھ اسے تھام لو اور خبردار دین میں نئی باتیں شروع نہ کرنا کیونکہ ہر نئی بات بدعت ہے اور بدعت ضلالت ہے۔ (سنن ابو داؤد، سنن ابن ماجہ، مسند احمد)

علامہ ابن رجب رحمۃ اللہ نے جامع العلوم والحکم کی حدیث نمبر اٹھائیس میں فرمایا کہ اس مذکورہ حدیث میں ہمارے لیے حکم دیا گیا ہے کہ تفرقہ اور اختلافات کے دور میں ہم سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کی سنت پر جمے رہیں، سنت سے مراد وہ راستہ جس پر چلنے کا حکم دیا گیا، لہٰذا احادیث مذکور میں حکم ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد خلفاء راشدین کے طریقہ کو اپنائیں عقائد، اعمال اور اقوال میں اسی سے سنت کی کامل اتباع ہو گی، اس لیے قدیم زمانہ میں اسلاف جب سنت کہتے تو یہ ساری چیزیں اس میں شامل ہوتیں اور یہی مفہوم مشہور علماء امام حسن، امام اوزاعی اور امام فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔

حدیث کے الفاظ میں ایک غور طلب علمی نکتہ یہ بھی ہے کہ سنت نبوی اور سنت خلفاء راشدین کے بعد یہ نہیں کیا گیا کہ دونوں کی سنتوں کو اپناؤ بلکہ واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا کہ اس سنت کو اپناؤ، گویا دونوں کو ایک حیثیت دی گئی۔

6۔ چھٹی دلیل: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یہودی اکہتر فرقوں میں اور نصاری بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، ایک کے علاوہ سب جہنم میں ہوں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا، وہ نجات پانے والا گروہ کونسا ہو گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، 'الجماعہ' دوسری ایک روایت میں ہے وہ جس پر میں اور میرے صحابہ گامزن ہیں۔

علامہ الشیخ عبد العزیز بن باز رحمۃ اللہ نے فرمایا: نجات پانے والے گروہ سے مراد وہ جماعت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے راستہ پر ہو گی جو توحید الٰہی کا اقرار کرنے والے اللہ کے حکم پر عمل کرنے والے اور منع کردہ چیزوں سے دور رہنے والے۔ اسی راستہ پر اپنے قول، عمل اور عقیدہ کے ذریعہ ثابت قدم رہنے والے یہی حق پر ہیں اور راہ حق کے داعی ہیں چاہے وہ کسی بھی علاقہ یا ملک میں آباد ہوں۔

قرآن وسنت پر عمل منہج سلف صالحین کے مطابق ضروری ہے

مشہور صحابی سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص کسی کی پیروی کرنا چاہے وہ ان کی پیروی کرے جو اپنی زندگی پوری کر کے وفات پا چکے ہیں کیونکہ جو زندہ ہیں، وہ کسی بھی وقت فتنوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور اس راہ میں کامیاب ترین گروہ صحابہ کرام کا گروہ ہے جو کہ اس امت کا افضل ترین حصہ تھے جن کے دل نیکی سے بھرے ہوئے جن کے علم میں گہرائی تھی اور جو تکلفات سے دور تھے۔

امام اوزاعی رحمۃ اللہ نے فرمایا: سنت کو مضبوطی سے تھامے رکھو، وہی کہو جو ثابت ہو اور ان باتوں سے بچو، جن سے اسلاف بچتے رہے، سلف صالحین کے راستہ پر چلو تمہارے لیے بھی وہی راستہ بہتر ہے جو ان کے لیے بہتر تھا۔

اور مزید فرمایا: تم سلف کے نقش قدم پر چلو، چاہے لوگ مخالفت ہی کریں، چوکنا رہنا لوگوں کی ذاتی آراء سے چاہے کتنی ہی ملمع سازی سے بات کریں۔
امام احمد بن حنبل نے کہا کہ صحابہ کرام کے راستہ کو اپنانا اور اس کی پیروی کرنا ہمارے نزدیک اصول سنت میں سے ہے۔
امام ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا: جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر میں سلف صالحین اور مشہور ائمہ کے بر خلاف گفتگو کرنے سے دو باتوں میں کوئی ایک لازمی ہوگی۔
یا تو خود اس شخص سے ذاتی طور پر غلطی ہو رہی ہے یا پھر سلف نے غلطی کی ہے۔ لیکن کسی بھی عقلمند کو اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ سلف صالحین کو غلط کہنے کے بجائے خود اس شخص کو غلط سمجھا جائے، البتہ اگر کسی کی عقل وخرد جواب دے گئی ہو تو اس کی حیثیت مختلف ہے جیسے کچھ لوگ کہتے ہیں، ہم بھی رجال یعنی انسان ہیں وہ بھی انسان تھے، یہ گویا ایسے متکبر شخص کا اندازہ ہے جو راہ ہدایت سے دور ہو چکا ہے، اللہ ہی اسے صحیح راستہ کی رہنمائی کرے۔(الصواعق المرسله على الجهميه والمعتزله:2/1)
امام شاطبی نے فرمایا: اکثر فرقے گمراہ اس لیے ہوئے کہ بظاہر وہ قرآن وسنت ہی سے استدلال کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن سلف کے اسلوب کو چھوڑ کر، گویا کہ سلف صالحین کے ذہن و دماغ میں وہ بات اور نکتہ نہیں آیا جو بعد میں آنے والوں کے ذہن میں آیا، اللہ کی پناہ اس گمراہ کن تصور سے۔“
اور مزید فرمایا: کہ اکثر گمراہ فرقوں میں دیکھا گیا، چاہے وہ بنیادی احکام ہوں یا فروعی مسائل میں کہ وہ اپنے باطل نظریات اور فرسودہ خیالات بلکہ بعض فاسق قسم کے لوگ بھی ظاہراً بزعم خود شریعت سے ہی استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جبکہ حقیقی شریعت اس سے پاک ہوتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ شرعی احکام پر غور کرتے ہوئے سلف صالحین کی طرف دیکھا جائے کہ انہوں نے مذکورہ مسئلہ کو کیسے سمجھا یا متعلقہ آیت یا حدیث کا مطلب کیا سمجھا، کیونکہ وہ حق کے متلاشی تھے اور علم و عمل میں تر تھے۔“
امام ابن قیم نے فرمایا: ”دیکھا گیا ہے کہ بہت سے کم علم لوگوں کی یہ غلطی ہے کہ کسی مسئلہ میں وہ قرآن وسنت کے بسا اوقات ظاہری نصوص کو تو دیکھتے ہیں لیکن ان کی نظر اس بات پر نہیں جاتی کہ اسی مسئلہ میں خود صاحب شریعت اور صحابہ کرام کا عمل کیا تھا، جو بعد میں آنے والوں سے زیادہ مسئلہ کی حقیقت کو سمجھتے تھے، لہٰذا جو تھوڑا بھی غور کرے گا وہ اس کی گہرائی کو سمجھ سکے گا اور صحیح مطلب تک پہنچ سکے گا یعنی قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام کا عمل۔“
امام حافظ ابن عبد الہادی نے فرمایا: یہ جائز ہی نہیں ہے کہ کسی آیت یا سنت کا وہ مفہوم بیان کیا جائے جو عہد نبوی ﷺ یا عہد صحابہ میں رائج نہیں تھا اور جسے سلف صالحین نے بیان نہیں کیا؛ کیونکہ اس طرح کرنے سے یہ متصور ہوگا کہ ان بزرگوں کو حق کا ادراک نہیں ہوا اور وہ گمراہ ہو گئے اور اب بعد میں آنے والے اعتراض کنندہ کو صحیح مسئلہ معلوم ہوا اور حق انہوں نے دریافت کر لیا!! اور اگر بعد میں آنے والے کی رائے ان سابقین اولین کی رائے کے مخالف ہو تو پھر مزید طرفہ تماشہ۔“
(الصارم المنكي في الرد على السبكي:318)
امام ابن کثیر نے سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 7 کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:
﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾
(سورۃ آل عمران:7)
کہ اللہ کا فضل وکرم ہے کہ کسی بدعتی کو قرآن مجید میں اپنی بدعات کی تقویت کے لیے کوئی دلیل نہیں ملتی، کیونکہ قرآن مجید آیا ہی حق کو باطل سے واضح کرنے کے لیے اور ہدایت کو ضلالت سے الگ کرنے کے لیے، اسی لیے قرآن مجید میں باہمی تعارض یا اختلاف نہیں، یہ کلام اللہ ہے جس کی ایک بات دوسرے سے متصادم نہیں ہو سکتی، یہ اللہ حکیم وحمید کا کلام ہے۔“
(تفسیر ابن کثیر: 1/144)
علامہ السعدی نے فرمایا کہ اس ضمن میں یہ بات بھی داخل ہے کہ کفار اور منافقین کی تکرار اور اعتراضات جو اللہ کے احکام کو کمزور کرنے اور اپنے کفریہ خیالات کو ثابت کرنے کے لیے کیا کرتے تھے، اسی سے ملتی جلتی صورتحال آج مختلف بدعتیوں کی ہے جو متشابہات کا سہارا لے کر بحث وجدال کرتے ہیں، لہٰذا باطل کو ثابت کرنے کے لیے ان کی بحث وتکرار اللہ تعالیٰ کے واضح احکام کے ساتھ تمسخر سمجھا جائے گا کیونکہ حق صریح، واضح اور سچائی پر مبنی ہوتا ہے۔
لیکن اس حقیقت کے باوجود آج کل کچھ لوگ سلف صالحین کے راستہ پر چلنے اور ان کے منہج کو اہمیت دینے کے بجائے یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ ”وہ بھی انسان تھے ہم بھی انسان ہیں۔“ یہ حکمت وبصیرت سے خارج بات ہے، جس کی تردید میں مختلف اہل علم نے کافی کچھ بیان کیا ہے۔
علامہ الشیخ عثیمین فرماتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت کا یہ اصول ہے کہ وہ مسائل میں مہاجرین وانصار صحابہ اور سلف صالحین کی طرف دیکھتے ہیں کہ زیر بحث مسئلہ میں ان کی کیا رائے ہے، کیونکہ ان کی پیروی کا مطلب ان کے ساتھ محبت وعقیدت کا اعتراف کرنا ہے، نیز اس لیے بھی کہ وہ حق اور سچائی سے قریب تر تھے، برخلاف وہ لوگ جو سلف کی طرف نہیں دیکھتے، بلکہ کہتے ہیں کہ وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں۔ گویا کہ ان کوتاہ بینوں کے ہاں حضرات ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی بات اور رائے اسی طرح کی ہے جیسے بعد میں آنے والے ایرے غیرے کی!! یہ بلاشبہ ضلالت ہے اور غلطی ہے، کیونکہ صحابہ کرام حق وراستی کے قریب تھے، ان کا قول بعد میں آنے والوں کے اقوال پر مقدم اور معتبر ہوگا، جیسے کچھ ان بزرگوں کا ایمان اور علم تھا، اور جو کچھ

انہیں فہم سلیم اور امانتداری کا ملکہ حاصل تھا اور پھر انہیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور براہ راست فیض پانے کا موقع ملا، وہ بعد میں آنے والوں سے بدرجہا بہتر اور اعلیٰ تھے۔

علامہ الشیخ صالح الفوزان نے فرمایا، جو شخص بھی صحابہ کرام کی مخالفت کرے، ان کی بے توقیری کرے اور یہ کہے کہ وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں، بلاشک وشبہ یہ بات اس کی جہالت اور گمراہی پر مبنی ہے، ہو سکتا ہے یا تو یہ بات کہنے والا خود جاہل ہو جو سوچے سمجھے بغیر کچھ کہہ رہا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے متعلق بغیر علم کے کچھ کہنا شرک کے مترادف ہے یا پھر ایسا آدمی خود فریبی کا شکار ہے جو سمجھتا ہے کہ اسے اتنا علم حاصل ہے کہ وہ صحابہ کرام کی بے ادبی اور تنقیص کر رہا ہے۔ (فتاوی الدروس العلمیہ)

علامہ الشیخ البانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ قرآن وسنت کی پیروی کر رہا ہے لیکن سلف صالحین کی پیروی نہیں کرتا تو گویا اپنی اس حرکت سے وہ اعتراف کر رہا ہے کہ وہ لوگ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں اور ایسا شخص گمراہ اور باطل پر ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ زمانہ قدیم میں بہت سے گمراہ فرقے اور موجودہ دور میں پائے جانے والے مختلف افکار اور نظریات کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ دین فہمی کا تیسرا بنیادی مصدر کتاب وسنت کے بعد سلف صالحین کی طرف رجوع کرنا لیکن انہوں نے اس سے انحراف کیا، اگرچہ ہر گمراہ فرقہ بظاہر قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے کا دعویٰ کرتا ہے، مگر منہج سلف کے بغیر۔ (موسوعۃ العقیدہ: 1/220)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات آشکار ہو چکی ہے کہ جو بھی قرآن یا حدیث کی تفسیر کرتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا تابعین کے برخلاف کوئی بات کرے گا وہ یا تو اللہ تعالیٰ کے حق میں مفتری سمجھا جائے گا یا پھر ملحد اور بے دین شمار ہو گا، یا تحریف کرنے والا متصور ہو گا جو اصل مفہوم ومعانی بگاڑ رہا ہے اور یہی الحاد اور زندیقیت کا راستہ ہے جو کہ باطل ہے، جو بھی دین اسلام کے اصولوں سے واقف ہو وہ اس طرز عمل کے ناقص اور غلط ہونے کا اندازہ آسانی سے کر سکے گا اور مزید فرمایا کہ جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ قرآن وسنت کا فہم صحیح حاصل کر سکتا ہے بغیر صحابہ کرام کی طرف رجوع کیے اور ان کے جادۂ حق سے ہٹ کر الگ اپنی روش اپناتا ہے ایسا شخص بلاشبہ بدعتی اور گمراہ ہے۔

(مختصر فتاوی مصریہ: ص556، تحقیق محمد حامد الفقی)

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا:

اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ ہر قول وعمل جو صحابہ کرام سے ثابت نہ ہو اس کا شمار بدعت میں ہو گا، کیونکہ اگر اس کام میں کوئی بھلائی اور خوبی ہوتی تو صحابہ اس میں پہل کرتے ہوئے سبقت لے جاتے کیونکہ ان بزرگوں کو جب کبھی کوئی خیر اور اجر کمانے کا موقع ملتا وہ اس کی طرف پہل کیا کرتے تھے۔

فہم سلف کے مطابق عمل کرنے کے فوائد

a اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمان پر عمل کرنے کے مترادف ہو گا، کیونکہ سلف صالحین کے راستہ کو اپنانے کا حکم ہمیں قرآن وسنت ہی سے ملتا ہے، جیسا کہ دلائل سے واضح ہو چکا ہے۔

b یہی حد فاصل ہے اہل سنت اور خواہشات نفس کے پجاریوں اور بدعتیوں کے درمیان کہ اہل سنت سلف کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

c یہ رب العالمین کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ ہے، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: "جو کوئی اخلاص کے ساتھ ان کے نقش قدم پر چلے گا اللہ ان سے راضی ہو گا۔"

d سلف صالحین کی پیروی کرنے میں جہنم سے نجات ہے، ورنہ جو اس راہ ہدایت کو چھوڑے گا، جہنم میں جھونک دیا جائے گا جو کہ برا ٹھکانہ ہے۔

e یہی اتحاد واتفاق کا مؤثر ذریعہ ہے، فہم سلف سے دوری فرقہ واریت اور اختلاف کا سبب ہے، جیسا کہ آیت سے واضح ہے۔

f فہم سلف کو اپنانا باعث ہدایت اور سبب نجات ہے، جیسا کہ کہا گیا:

﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا﴾

☆☆☆

ڈڈلی، حاجی عبدالخالق انتقال کر گئے

ڈڈلی کی بزرگ شخصیت حاجی راجہ عبدالخالق جنجوعہ بھی چل بسے۔ ڈڈلی مڈلینڈ کی بزرگ شخصیت حاجی راجا عبدالخالق جنجوعہ 83 سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون! بزرگوار راجہ صاحب زندہ دل، خوش اخلاق اور اعلیٰ کردار سے متصف تھے، ڈڈلی میں مسجد کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور کیمونٹی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ ڈالتے تھے۔ جامع مسجد میں کوئینس کراس ڈڈلی میں ڈاکٹر عبد الرب ثاقب نے ان کی نماز جنازہ ادا کی اور بریلے ہل قبرستان میں ان کی اہلیہ کے قریب ان کی تدفین عمل میں آئی، پسماندگان میں تین فرزند راجہ افراہیم، راجہ سرفراز اور راجہ ممتاز اور تین بیٹیاں سوگواروں میں شامل ہیں۔

سوال: ایک خاتون کا سوال ہے کہ میری پہلی بچی جو اب ڈھائی سال سے زیادہ کی ہو چکی ہے، اسے میں نے دو سال اپنا دودھ پلایا ہے لیکن وہ دوسرے کسی بھی قسم کے دودھ جیسے گائے، بکری بھینس کے دودھ سے شدید الرجی رکھتی ہے، اب صورتحال یہ ہے کہ میری دوسری بچی اب میرا دودھ پی رہی ہے لیکن یہ اس کثرت سے پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق مجھے زائد دودھ کو بذریعہ پمپ نکال کر ضائع کر دینا چاہیے، کیا اس سے بہتر یہ نہیں ہے کہ میں اس زائد دودھ کو کپ میں ڈال کر اپنی پہلی بچی کو پلادوں، جو اس کے لیے قدرتی کیلشیم کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ چونکہ مدت رضاعت صرف دو سال ہے اس لیے کیا میرے لیے ایسا کرنا جائز ہو گا؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ دو سال سے زیادہ دودھ پلانا ناجائز نہیں ہے۔ اگر بچہ دو سال کے بعد بھی دودھ پینے کا خواہشمند ہو تو اسے دودھ پلانے میں قطعاً کوئی حرج نہیں، جب تک کہ وہ خود نہ چھوڑ دے۔

اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی اس آیت میں تو مدت رضاعت دو سال بتائی گئی ہے:

﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ۖ لِمَنْ أَرَادَ أَن يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾

"اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں اس شخص کے لیے جو رضاعت کی پوری مدت (دودھ پلوانا چاہتا ہوں۔)(سورۃ البقرۃ:233)

یہ آیت طلاق کے احکامات کے ضمن میں بیان ہوئی ہے، ایک عورت جو طلاق کے وقت حاملہ تھی، بچے کی ولادت ہوتے ہی اس کی عدت ختم ہو گئی، شوہر سے اس کا رشتہ ختم ہو گیا لیکن بچے کا باپ چاہتا ہے کہ وہ اسے دودھ پلائے۔

ایک مطلقہ عورت ہو سکتا ہے کہ یہ چاہے کہ میں اس بچے کو صرف ایک سال یا ڈیڑھ سال دودھ پلا کر فارغ کر دوں تو اللہ کی طرف سے حکم دیا جائے کہ عورت کو رضاعت کی پوری مدت یعنی دو سال دودھ پلانا چاہیے، دو سال سے زیادہ اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا اور اسی لیے اس آیت کے فوراً بعد کہا گیا کہ جس مرد کا بچہ ہے وہ اس بات کا پابند ہے کہ اس دوران عورت کے رواج کے مطابق خرچ برداشت کرے۔

خاتون کا دوسرا سوال زائد دودھ کو ایک کپ میں ڈال کر پہلی بچی کو پلانے سے متعلق ہے تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ تو اس کی اپنی بچی ہے۔ اگر وہ کسی دوسرے کے بچے کو یہی دودھ پلاتی تو پھر بربنائے رضاعت وہ اس کی رضاعی ماں کہلاتی۔ اس کا شوہر اس بچے کا رضاعی باپ اور اس کے اپنے بچے اس کے رضاعی بھائی بہن کہلاتے اور یہ بھی اس صورت میں ہے کہ یہ دودھ شروع کے دو سال میں پلایا جاتا اور کم از کم پانچ مرتبہ پلایا جاتا تو پھر رضاعت کی وجہ سے حرمت ثابت ہوتی۔

واللہ الموفق

☆☆☆

سوال: ایک خاتون کا سوال ہے کہ آیا انگوٹھی کے نگینہ پر لفظ 'اللہ' یا 'محمد' کا نقش کرانا جائز ہے؟ خاتون نے اپنی انگوٹھی کی تصویر بھی ارسال کی ہے جس پر صرف 'اللہ' کا نقش ہے۔

جواب: ہم علماء کی آراء درج کرنے سے قبل اس موضوع پر چند احادیث اور آثار نقل کرتے ہیں:

1۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی بنوار کھی تھی جس پر 'محمد رسول اللہ' منقوش تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "میں نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی ہے اور جس پر 'محمد رسول اللہ' کا نقش کروایا ہے، تو کوئی شخص یہی نقش اختیار نہ کرے۔"

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

2۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت الخلا میں داخل ہوئے تو انگوٹھی اتار دیتے۔ (سنن ابو داؤد)

اور اس پر 'محمد رسول اللہ' لکھا ہوا تھا۔

3۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ چند آثار درج کیے گئے ہیں: عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی انگوٹھی کا نقش ان کا اپنا نام تھا۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کا نقش تھا: الحمد للہ

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا نقش تھا: اللہ الملک

حضرات الحسن اور الحسین رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ انگوٹھی پر اللہ کا ذکر (یعنی نقش) قائم کرنے میں کوئی حرج نہیں اور یہی قول عطا سے بھی منقول ہے۔

تابعین میں سے ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا نقش 'باللہ' اور مسروق کا 'بسم اللہ' تھا۔

ابن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی انگوٹھی پر 'حسبی اللہ' لکھوائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

ان آثار کی روشنی میں علماء یہ آراء رکھتے ہیں:

شیخ ابن باز، شیخ محمد بن العثیمین اور شیخ صالح الفوزان رحمہم اللہ کی رائے میں صرف 'اللہ' یا صرف 'محمد' لکھنا جائز نہیں ہے، الّا یہ کہ وہ کسی نام کا جزء

ہوں جیسے 'عبد اللہ' یا عبد الرحمٰن یا کوئی دوسرا نام جس کا جزو محمد (ﷺ) ہو۔

کئی دوسرے علماء جن میں صالح المنجد، محمد العریفی، محمد العدوی، عبد الشکور البابیدی شامل ہیں۔ جواز کے قائل ہیں لیکن سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایسی کوئی صورت نہیں ہونی چاہیے جس سے 'اللہ' اور 'محمد (ﷺ)' کے ناموں کی تحقیر ہوتی ہو۔ اس لیے بیت الخلاء جاتے وقت یا تو انگوٹھی کو باہر اتار دے یا اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں لے لے اور وہ بھی اس صورت میں کہ باہر چھوڑے جانے پر اس کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہو۔

یہ دوسری رائے راجح معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کے رسول کی انگوٹھی میں نام محمد (ﷺ) شامل تھا، جس چیز سے منع کیا گیا تھا وہ یہ پوری عبارت تھی: محمد رسول اللہ

اور پھر نبی ﷺ کے دونوں نواسوں سیدنا حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما کی رائے بھی اس کے حق میں ہے، لیکن بہر صورت انگوٹھی کی تحقیر کسی صورت میں نہیں ہونی چاہیے، اگر اس پر اللہ یا 'محمد (ﷺ)' کا نقش موجود ہے۔

☆☆☆

سوال: ایک حدیث اکثر پیش کی جاتی ہے کہ "میری امت کا اختلاف باعث رحمت ہے" تو اس بارے میں وضاحت کریں۔

جواب: اس بارے میں میں اپنے شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کی تحقیق کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

"اِخْتِلَاف أُمَّتِي رَحْمَة" کے الفاظ پر مشتمل اس قول کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف درست نہیں ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ شاید حفاظ حدیث کی کسی کتاب میں اس قول کی کوئی سند بیان کی گئی ہو جو ہم تک نہیں پہنچی۔ (الجامع الصغیر)

تاج الدین السبکی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "ایسی کوئی حدیث محدثین کے ہاں معروف نہیں ہے، باوجود کوشش کے مجھے اس کی کوئی سند، صحیح یا ضعیف یا موضوع (بناوٹی) نہیں ملی۔"

معنٰی کے اعتبار سے بھی یہ حدیث قابل انکار ہے۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"یہ کہنا تو بالکل فاسد معلوم ہوتا ہے، اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ اگر اختلاف رحمت ہے تو اتفاق ناراضگی کا باعث ہو گا اور یہ کہنا تو ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے، وہ اس لیے کہ یا اتفاق ہو گا اور یا اختلاف، اسی طرح یا رحمت ہو گی یا زحمت (ناراضگی)۔ (الاحکام فی اصول الاحکام:5/64)

اس مکذوب حدیث کے رواج پا جانے کی وجہ سے امت میں ایک انتشار برپا ہے اور اسی کو حجت مان کر چاروں مذاہب کے درمیان شدید اختلاف کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، بلکہ قرآن اور مستند سنت کی طرف رجوع کرنا بھی دائرہ نسیان کی نذر ہو گیا ہے، حالانکہ ائمہ اربعہ نے خود اسی بات کا حکم دیا تھا کہ اگر ہمارا قول حدیث کے خلاف پایا جائے تو حدیث ہی کو مانا جائے نہ کہ ہمارے اقوال کو اور اسی قول کو ماننے کا مطلب تو یہ ہے کہ شریعت میں تناقض یا تضاد پایا جاتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے:

﴿ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴾(سورۃ النساء:82)

"اور اگر یہ (قرآن) اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔"

گویا اختلاف کا ہونا اللہ کی طرف سے نہیں ہے، تو پھر اختلاف خود ایک شریعت کیسے بن سکتا ہے، سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تو کہتے ہیں کہ اختلاف ایک برائی ہے۔ لیکن ائمہ اربعہ کے بعد اکثر مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ بہت سے اعتقادی اور عملی مسائل میں اختلاف رکھتے ہیں اور صرف اس لیے کہ وہ اختلاف کو رحمت گردانتے ہیں، قرآن اور حدیث کی طرف رجوع نہیں کرتے بلکہ اپنے اپنے مذہب پر سختی سے قائم رہتے ہیں، اور اسی اختلاف کا شاخسانہ ہے کہ چاہے مسجد میں اول وقت پر نماز کھڑی کی جائے تو ایک شخص صرف اپنے امام کی تقلید میں اس جماعت میں شامل نہ ہو گا کیونکہ اس کے نزدیک یہ جماعت قائم کرنا درست نہیں ہے۔ حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ تو یہ ارشاد فرمارہے ہیں کہ

«إذا أُقِيمَتِ الصَّلاَةُ فَلاَ صَلاَةَ إِلّا الْمَكْتُوبَةَ » (صحیح مسلم)

"جب نماز کھڑی کر دی جائے تو اس وقت سوائے اس فرض نماز کے اور کوئی نماز جائز نہیں ہے۔"

گویا یہ نماز ہمارے لیے نہیں بلکہ کسی اور شریعت کے مطابق ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شریعت میں اختلاف ایک قابل مذمت امر ہے، اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے اور وہ اس لیے بھی کہ اس کی وجہ سے امت مضبوط نہیں بلکہ کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ﴾ (سورۃ الانفال:46)

"اور جھگڑا نہ کرو کہ پھر تم ناکام ہو جاؤ اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے۔"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صحابہ تو تمام لوگوں سے افضل تھے تو ان میں بھی اختلاف پیدا ہوا تھا؟ ابن حزم رحمہ اللہ نے اس سوال کا جواب دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہرگز نہیں! انہیں ایسی کوئی مذمت لاحق نہیں ہو گی کیونکہ ان میں سے ہر شخص راہِ حق کا طالب تھا، اگر ان میں سے کسی سے غلطی بھی ہوئی تو ان کی نیک نیتی کی بنا پر اسے ایک اجر ملے گا، انہیں اس غلطی کی بنا پر کوئی گناہ لاحق نہ ہو گا کیونکہ انہوں

نے جان بوجھ کر کبھی ایسا نہیں کیا اور ان میں سے جس کی رائے صائب ہوئی اسے دہرا اجر ملے گا اور یہی معاملہ پھر قیامت تک ہر مسلمان کا بھی رہے گا کہ وہ غیر منصوص امور میں اجتہاد کریں گے تو غلطی پر ایک اور درست رائے پر دگنے ثواب کے مستحق ہوں گے۔

مذمت کے مستحق صرف وہ لوگ ہوں گے جو نص جان لینے کے بعد اللہ کی رسی قرآن کو اور سنت رسول ﷺ کو چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے کسی مقتدی یا امام کی تقلید اختیار کرتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ قرآن وسنت کی طرف رجوع کریں، وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اگر قرآن وسنت ان کی آراء سے متفق ہیں تب تو انہیں قبول کر لیتے ہیں لیکن اگر متفق نہ ہوں تو وہ اپنی آراء ہی کو اختیار کیے رہتے ہیں۔ یہی لوگ قابل مذمت ہیں۔ ایک قسم ان لوگوں کی بھی ہے جو دین اور تقویٰ میں کمزور ہونے کی بنا پر ہر اس شخص کا قول قبول کر لیتے ہیں جو ان کی اپنی خواہش کے مطابق ہو۔ انہیں ہر عالم کی دی گئی رخصت مطلوب ہوتی ہے، انہیں اس بات کی غرض نہیں ہوتی کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا منشا ومطلب کیا ہے اور اسی کو 'تلفیق' کے نام سے جانا جاتا ہے کہ کسی بھی عالم کا قول بغیر کسی دلیل کے قبول کر لیا جائے کیونکہ وہ رخصت عطا کرتا ہے اور ان کی خواہش کے مطابق بھی ہوتا ہے۔ علماء نے اس کے جائز ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اختلاف کیا ہے لیکن حق بات یہی ہے کہ ایسا کرنا حرام ہے۔ یہ لوگ دلیل کے طور پر ایک ضعیف اثر کو پیش کرتے ہیں:

" من قلّد عالما لقي الله سالما "

"جس نے کسی عالم کی تقلید کی تو وہ اللہ سے سلامتی کے ساتھ ملے گا۔"

ایسے ضعیف اقوال سے بچنا چاہیے، اگر قیامت کے دن نجات مطلوب ہے تو یہ آیت پیش نظر رہے:

﴿يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ 0 إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ﴾ (سورۃ الشعراء:88-89)

"جس دن نہ مال کام آئے گا نہ بیٹے، سوائے اس شخص کے جو اللہ کے پاس ایک سلامت سے بھرپور دل کے ساتھ آئے۔"

شیخ البانی رحمہ اللہ کی کتاب 'سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعہ:1/276-278)

☆☆☆

سوال: لندن سے ایک طالب علم سوال کرتے ہیں کہ میں ایک یونیورسٹی میں Chiropractic (جوڑوں اور ہڈیوں کے دردوں کا علاج) کا طالب علم ہوں جہاں لڑکے اور لڑکیاں دونوں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ دوران تعلیم ہمیں ہاتھ سے ریڑھ کی ہڈی، کندھے تک پورا ہاتھ، کولہے سے پاؤں تک اور پھر مختلف جوڑوں اور ہڈیوں کو برہنہ حالت میں معائنہ کرنا ہوتا ہے اور اس مقصد کے لیے طلبہ اور طالبات اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں تا کہ اس طریق علاج کا عملی مطالعہ ہو سکے، یہاں یہ چند سوال پیدا ہوتے ہیں:

1۔ مسلم طالبات کے لیے حجاب اور شرم وحیا کے تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے کہاں تک عملی طور پر ان کلاسز میں شمولیت اختیار کی جا سکتی ہے؟

2۔ خود مرد حضرات کے لیے بھی درست رویہ کیا ہو گا؟

3۔ اس علم کو ہماری کمیونٹی میں مقبول بنانے کے لیے کیا تجاویز رکھی جا سکتی ہیں؟

جواب: جہاں تک اس علم کا تعلق ہے تو اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، دوسری میڈیکل شاخوں کی طرح ایک طالب علم کو اس علم میں بھی مہارت حاصل کرنی چاہیے:

1۔ جہاں تک طالبات کی شمولیت کا تعلق ہے تو ان کے لیے علیحدہ کلاسز کا مطالبہ کیا جانا چاہیے جہاں تدریس کے لیے معلمات متعین کی جائیں۔

اس طریقہ علاج میں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ کپڑے (جیسے بنیان) کے اوپر سے بھی مسّ کیا جا سکتا ہے یعنی ضروری نہیں کہ کپڑا اتارا جائے۔

اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو طالبات ضرورت کی بنا پر عملی تجربات میں شریک ہو سکتی ہیں لیکن ضرورت کا تعین اس کی مطلوبہ مقدار سے ہوتا ہے۔ یعنی جسم کا وہ حصہ اتنا ہی ظاہر کیا جائے جتنا مطلوب ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

2۔ مردوں کے لیے چونکہ حجاب اور ستر کی وہ پابندیاں مطلوب نہیں ہیں جو خواتین سے متعلق ہیں تو ان کی شمولیت میں زیادہ قباحت نہیں ہے لیکن پھر بھی مخلوط تجربات کے دوران انہیں بھی ضرورت سے زیادہ کسی عضو کا اظہار جائز نہیں۔

3۔ اگر طالبات کے لیے علیحدہ کلاسز کا اہتمام ہو سکے تو مسلمان خواتین کے لیے اس طریقہ علاج کے سیکھنے میں زیادہ اشتیاق پیدا ہو سکتا ہے۔

☆☆☆☆

حاجی عبد المتین کی خوشدامن پاکستان میں وفات پا گئیں

جامع مسجد کوٹنس کراس ڈڈلی کے ذمہ دار حاجی عبد المتین نمبردار کی خوشدامن بدرہ منیر 85 سال کی عمر میں پاکستان میں وفات پا گئیں۔ مرحومہ نیک وصالحہ اور توحید وسنت کی پابند تھیں۔

مانچسٹر کی دینی، سماجی وکاروباری شخصیت حاجی اشرف انتقال کر گئے

مانچسٹر کی دینی سماجی اور کاروباری شخصیت حاجی اشرف کورونا کے باعث داغ مفارقت دے چکے ہیں، جس کے باعث برمنگھم کی معروف باجی محترمہ باجی نوید خوشی جو مرحوم کی چھوٹی بہن ہیں، بڑی ہی دکھی ہیں، امام وخطیب مکی مسجد مانچسٹر حافظ حمود الرحمٰن مکی اور دیگر مکی مسجد کے نمازی سب سوگوار ہیں اور محمد اسحاق عزیز اور عبد الرحمٰن عزیز سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے دعا کی۔

اِسلام کا خاندانی نظام

حفیظ الرحمن اعظمی عمری

کسی بھی خاندان کے بنانے، سنوارنے، برباد کرنے، نیک نام یا بدنام کرنے، جوڑ کر رکھنے یا توڑنے میں عورت کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ اسی لیے مرد شادی کی سوچتا اور ارادہ کرتا ہے تو شریعت اسلامیہ نے شریکِ حیات کے انتخاب کو بڑی اہمیت دی ہے۔ دین دار اور باصلاحیت بیوی کو دنیا کا سب سے بڑا انعام قرار دیا گیا ہے۔ اولاد کی قابل تعریف نشو ونما اور لائق ذکر تعلیم وتربیت کا دور ماں کی گود اور آغوش سے شروع ہوتا ہے۔ بنیاد کا پتھر صحیح ہو جائے تو ثریا تک بنی دیوار سیدھی جاسکتی ہے۔ خشتِ اول ہی میں کچھ گڑبڑ اور کجی آ جائے تو اخیر تک اس کے اثرات نمایاں رہتے ہیں۔

اسلام ایک ایسا خاندان چاہتا ہے جس میں افرادِ خاندان امن وامان، سکون و راحت اور عافیت وطمانیت کے ساتھ خوش گوار زندگی بسر کر سکیں۔ ایسا ماحول اسی وقت ممکن ہے جب ہر شخص چاہے مرد ہو یا عورت، اپنے حقوق وفرائض ٹھیک ٹھیک پہچان کر ادا کرنے اور نبھانے کی کوشش کرتا رہے۔ انسانی معاشرہ مرد اور عورت کے تعلق سے شروع ہوتا ہے۔ اسلام نے میاں بیوی کے رشتے میں بڑا توازن اور اعتدال رکھا ہے۔ دونوں کے حقوق وفرائض کا دائرۂ کار متعین کیا ہے۔ زن وشوہر کو ایک دوسرے کا لباس قرار دے کر ایک دوسرے کے عیوب ونقائص پر پردہ پوشی کا حکم دیتا ہے۔ مرد کو محنت ومشقت کے کام دے کر عورت کو اس کی بالادستی قبول کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ دوسری طرف عورت کی نزاکت ولطافت اور اس کی فطری جلد بازی کا خیال رکھ کر مرد کو حکم دیتا ہے کہ اس کی کسی ایک کمزوری پر برافروختہ نہیں ہونا ہے۔ ایک کمزوری نظر انداز کر دو گے تو اس کی بیشتر خوبیاں تمہاری نظروں میں آئیں گی:

﴿فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ (سورۃ النساء:19)

"ہو سکتا ہے کہ ایک بات تم ناپسند کرتے ہو اور اسی میں اللہ نے تمہارے لیے بہت کچھ بہتری رکھ دی ہو۔"

گھر کی عزت عورت کی قابلیت وصلاحیت سے ہے۔ یہ سب کے علم میں ہے۔ یہ حقائق زندگی کا فلسفہ نہیں کہ پڑھے لکھے لوگ ہی سمجھ سکیں۔ کتابوں سے دور اور علم سے محروم میاں بیوی بھی بخوبی جانتے، سمجھتے اور برتتے ہیں۔ باہمی سمجھوتے کے بغیر زندگی کی گاڑی کامیابی کے ساتھ اپنا سفر طے نہیں کر سکتی۔

اس طول طویل تمہید کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ اسلام مشترکہ خاندانی نظام پسند کرتا ہے یا جداگانہ نظام کو، جس میں خاندان کے صرف عناصرِ اربعہ ہی ہوں گے: ماں، باپ، بیٹا، بیٹی۔ یہ سوال جس قدر آسان اور مختصر ہے، اس کا جواب اسی قدر مشکل اور مفصل ہے۔

اسلامی احکام وتعلیمات دنیائے انسانیت کے لیے امن وسکون اور راحت ومسرت کا پیغام وانعام ہیں۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ مسلمان جہاں بھی رہیں، جیسے بھی رہیں، مسائل ومشاکل پیدا کیے بغیر خود بھی سکھ کے ساتھ خوش رہیں اور دوسروں کے آرام وراحت کا بھی پوری طرح خیال ولحاظ رکھتے رہیں۔ آداب معاشرت کے طور طریقوں کی مکمل پابندی اور پاسداری ہو۔ گھر میں رہیں یا گھر سے باہر، ان کی ذات، بات اور کوئی بھی حرکت دوسروں کی تکلیف کا باعث نہ بنیں۔

خاندان کا اسلامی تصور بڑا آفاقی ہے۔ ساری دنیائے انسانیت کو ایک ہی خاندان کے افراد گردانتا ہے۔ فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (سورۃ الحجرات:13)

"اے لوگو! ہم نے دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور تمہیں نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا، اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ۔ امتیاز وشرف اسی کے لیے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔"

آدم کی اولاد کے ماں باپ ایک ہی ہیں۔ خاندان اور قبائل کی تقسیم صرف اسی لیے حساب میں لائی گئی کہ ایک دوسرے کے حقوق اور ان کی ضرورتوں کو پہچان کر میل ملاپ اور صلہ رحمی کے حقوق وفرائض آسانی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ اسلام میں خاندان کا بڑا اونچا مقام اور احترام ہے۔ خاندانی نظام کا وقار اور اس کی پسندیدہ روایات واقدار کو برقرار رکھنا اور ہر قسم کی پراگندگی سے محفوظ رکھنا مسلمان کا اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے۔ زنا کی برائی پر اسلام کی سخت ترین مذمت اور سنگین سزا صرف اسی لیے ہے کہ اس کی لعنت ونحوست کی وجہ سے خاندن نہ صرف بدنام ہوتا ہے، بلکہ پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ خاندان کا وقار اور اس کے افراد کا اعتبار بری طرح مجروح ہو جاتا ہے۔ ایسے منحوس وملعون کسی بھی خاندان کے چشم وچراغ نہیں کہلا سکتے۔ معاشرے

میں وہ سربلند کر کے چل نہیں سکتے، آنکھیں ملا کر باتیں نہیں کر سکتے۔ خاندان ایک محترم اور معتبر نام ہے، اس سے رشتے جوڑنے اور وابستہ رہنے کے لیے شرافت و نجابت بنیادی عنصر ہے۔

خاندان جتنا بڑا ہوتا ہے، اس کے مکین و مکان بھی اتنے ہی بڑے اور پھیلے ہوئے ہوں گے۔ مسائل کا انبار ہو گا تو سربراہِ خاندان کو بڑے ظرف، حوصلے، صبر و تحمل اور حکمتِ عملی کی ضرورت ناگزیر ہو گی۔ مسائل گوناگوں ہوں گے۔ مشترک خاندان کے افراد مختلف رجحانات و میلانات کے ہوں گے۔ ان کے روزگار کے وسائل و مسائل میں اونچ نیچ ہو گی۔ کھانے پینے، رہنے سہنے، پہننے اوڑھنے کے معیارات بھی متفرق ہوں گے۔ اولاد بھی کسی کی کم اور کسی کی زیادہ ہو گی۔ تعلیم و تربیت میں بھی آگے پیچھے اور اوپر نیچے، کچھ کفایت شعار اور کچھ فضول خرچ ہوں گے۔ صحت اور تندرستی، حسن و جمال اور ذہن و دماغ میں بھی علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ ان کی خواتین اور بیگمات کی زبان، اندازِ بیاں، ذوق و شوق اور سوچ بچار میں نمایاں فرق ہو گا۔ سربراہ کے لیے ان سب کو جوڑ کر رکھنا، محبت والفت برقرار رکھنا، سب کو ہنسی خوشی راضی بہ رضا رکھ کر ساتھ لے کر چلنا ایک بڑے امتحان سے کم نہ ہو گا۔ ایسے گھمبیر مسائل کیسے حل کیے جائیں گے، اس کی بھرپور تعلیم کتاب و سنت میں موجود ہے، مگر اس کے آگے سر تسلیم خم کر کے سب کے حقوق کا تحفظ اور اپنی شخصیت کو سید القوم خادمھم کی سطح پر لانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ نت نئے مسائل درپیش ہوں گے تو حکمت و دانائی کے ساتھ سب کو مطمئن کرنا آسان تو نہیں ہو گا۔ عہدِ نبوت میں ایک گھر میں دو بھائی رہتے تھے۔ ایک نے دربارِ رسالت میں شکایت کی کہ دن بھر روزی روٹی کے لیے میں محنت کرتا ہوں، جب کہ میرا بھائی مسجد میں آپ کی صحبت میں وقت گزارتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَعَلَّكَ تُرْزَقُ بِهِ»(جامع ترمذی)

”تمہیں جو رزق ملتا ہے، شاید وہ اسی کی نیکیوں کی بدولت ہے۔“

طرفین کو ایسے فیصلے پر راضی رکھنا اور ہنسی خوشی برداشت کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے علم، مہارت، تجربے اور دور اندیشی کے ساتھ ہر دل عزیزی بھی لازم ہے۔ ایک بھی فریق اَڑ جائے یا اکڑ جائے تو خاندان کی شیرازہ بندی بکھر کر رہ جائے گی۔ بڑوں کو چھوٹوں کے ساتھ رحمت وشفقت، چھوٹوں کو بڑوں کے ساتھ اکرام واحترام کا مکمل لحاظ رکھنا ہو گا۔ برابری کے افراد کچھ دو اور کچھ لو، کے اصول پر خندہ پیشانی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ہر چھوٹے بڑے کام کو انجام دیں گے۔ خواتین اپنی سطح سے بلند ہو کر معافی دینے اور معافی چاہنے کا حوصلہ رکھیں گی۔ کم عمر نونہالوں کی آپسی لڑائی میں فریق بنے بغیر ثالث بن کر ایک دوسرے پر الزام نہ رکھ کر ہنسی مذاق میں معاملے کو سلجھائیں گی۔ بچوں کے معاملات و نزاعات بے جا تو کیا بجا طرف داری بھی اچھے نتائج نہیں لائے گی۔ اس میں ذرا بھی کمی بیشی اور امتیازی سلوک مشترکہ خاندان کی بنیاد کو ہلا کر رکھ دے گا۔

حقیقت میں خاندان اللہ کی بڑی نعمت ہے اور انسان کی عظمت وطاقت میں اضافے کا موجب ہے۔ قرآن وحدیث اور سیرت و تاریخ میں آپ کو بہت سے واقعات اس موضوع پر پڑھنے کو ملیں گے۔ خاندان کا رعب داب مخالفین کو لرزا دیتا ہے۔ سیدنا شعیب علیہ السلام کی دعوت اصلاح سے سارا معاشرہ بیزار اور ناراض ہے۔ لوگ آپ کو سخت سے سخت اور سنگین سزا دے کر ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینے کا ارادہ کرتے ہیں، لیکن آپ کی خاندانی عظمت و شوکت سے مرعوب اور سہمے ہوئے ہیں۔ اپنی بے بسی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

﴿ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ ۖ وَمَا أَنتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ﴾(سورۃ ہود:91)

”اگر (تمہارے ساتھ) تمہاری برادری کے آدمی نہ ہوتے تو ہم ضرور تمہیں سنگ سار کر دیتے۔ ہمارے سامنے تمہاری کوئی ہستی نہیں۔“

یعنی ہمارے پاس تمہاری شخصیت کی کوئی حیثیت نہیں، اگر تمہارا خاندان نہ ہوتا تو ہم کبھی کا سنگسار کر دیے ہوتے۔

مکہ مکرمہ میں دشمنانِ اسلام نے رسول اکرم ﷺ کی آوازِ حق کو دبانے اور ختم کرنے کے لیے کئی خطرناک اور ناپاک منصوبے بنائے، مگر انجام دینے کی راہ میں رسول اکرم ﷺ کی خاندانی عظمت و شوکت ہی ہر بار آڑے آئی اور انہیں باوجود کوشش وخواہش کے اسی خوف نے کسی انتہائی اقدام سے باز رکھا کہ بنو ہاشم اور عبد مناف کا پورا خاندان ہمارے مقابلے میں آ جائے تو ہم ذلیل وخوار ہو کر رہ جائیں گے۔

بہر حال خاندان کی قوت وطاقت اور معاشرے میں اس کے اثرات سے کسی کو انکار تو کیا، شک وشبہ بھی نہیں ہو سکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ خاندان جتنا بڑا ہو گا، اس کے مسائل بھی پیچ در پیچ ہوں گے۔ خصوصاً مسلمان کے لیے اسلام کے سارے احکام پر عمل پیرا ہو کر صلہ رحمی کے تقاضوں کی تکمیل اور ہر حق دار کو اس کا حق دینا، معاشرتی آداب کا پورا لحاظ رکھنا، نیز حجاب اور پردے کے نازک اور باریک مسائل کی پابندی قدم قدم پر آزمائش بنی رہے گی۔ ہر رشتے کا ایک متعین اور مقررہ حق ہے۔ اس میں ذرا سی غفلت نظام اسرہ کو درہم برہم کر کے رکھ دے گی۔ باپ کا مقام بتایا، بڑے بھائی کو محترم قرار دیا، چھوٹوں کو رحمت وشفقت کا حق دار ثابت کیا، ماں کے قدموں کے نیچے جنت کی خبر دی، خالہ کو ماں کے برابر کا درجہ بخشا، یتیم کی کفالت وتربیت پر پورا زور صرف فرمایا، اولاد کے درمیان عدل وانصاف کا حکم دیا اور معمولی سے معمولی بات کی اصلاح میں نظر کرم فرمائی۔ مجلس میں آپ خطاب فرما رہے ہیں۔ اصحاب رسول ہمہ تن گوش ہیں اور سب پر

آپ کی نظر عنایت ہے۔ ایک شخص کا بیٹا آتا ہے۔ وہ اسے بوسہ دے کر گود میں بٹھالیتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کی بیٹی آتی ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر پہلو میں جگہ بنالیتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«ماعدلت بينهما» (سلسلۃ الصحیحہ:6/1249)

"میرے بھائی! تم نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔"

گھر میں نوکر چاکر ہوں گے۔ ان کے ساتھ سلوک ومعاملہ اور سب سے نازک مسئلہ عم زاد، پھوپھی زاد، خالہ زاد، ماموں زاد، دیور، جیٹھ اور نسبتی بہنیں، ان کے ساتھ پردے اور حجاب کے مسائل، ان سے آزادانہ اختلاط اور بے تکلفی کی نشستیں یہ سب اسلام میں سخت معیوب وممنوع ہی نہیں، دشمن جان وایمان بھی ہیں۔

گھر کے افراد زبان وبیان ہی میں محتاط نہیں، طنز وطعن، تضحیک وتحقیر کا ہلکا لفظ تو کیا آنکھوں کے اشاروں، ہونٹوں کی حرکت اور پیشانی کے بل سے بھی کسی کی دل آزاری ہو جائے تو یہ ناقابلِ برداشت حرکت ہو گی اور اس کے نتائج بھیانک ہوں گے۔ گھر کی چھوٹی بات بھی باہر جائے تو دور تک سنائی دے گی:

سبزۂ پامال سے بھی وجہِ بربادی نہ پوچھ
بات چل نکلی تو پھر یہ باغ باں تک جائے گی

خاندان کا اعتبار ووقار بری طرح مجروح ہو گا۔ جلنے جلانے والوں کے لیے نئے نئے موضوع ملتے چلے جائیں گے۔

مشترکہ خاندان کی برکت وطاقت اور اس کی عظمت واہمیت پر بہت سی باتیں قارئین کے سامنے آ گئیں۔ دلائل بھی عقلی، نقلی سب جمع کرنے کی کوشش کی گئی۔ خاندان جتنا بڑا ہو گا، معاشرے میں اس کا اتنا ہی بڑا مقام ہو گا۔ لیکن جن کے مقام رہتے ہیں بڑے، ان کے مسئلے بھی بہت۔

امہات المؤمنین کو قرآن نے کتنا اونچا مقام دیا۔ عام خواتین سے ان کو بالکل الگ بتا کر یہ بھی سنا دیا کہ ان کی خطاؤں پر سخت گرفت ہو گی اور ان کی سزائیں بھی دوگنی ہوں گی:

﴿يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَن يَأْتِ مِنكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾
(سورۃ الاحزاب:30)

"اے نبی کی بیویو! تم میں جو کھلی ہوئی برائی کی مرتکب ہوں گی، اس کو دوہرا عذاب دیا جائے گا اور یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔"

مشترکہ خاندان پسندیدہ ہے، قابل تعریف ہے اور سب کے لیے لائق فخر ہے، لیکن کتاب وسنت کے احکام کو سر اور آنکھوں پر رکھ کر زندگی بسر کرنا سربراہ کے لیے آسان ہے اور نہ ماتحتوں کے لیے۔ بھول چوک، کمی اور کسر سے مفر نہیں۔ احکام کی تفصیل میں نہیں پیش کر سکا، کیونکہ سب کے علم میں ہے کہ ذمے داریوں کی فہرست کتنی طویل ہے اور سرپرست کو کتنا عالی ظرف، بلند حوصلہ، صاحب تدبیر اور حکیمانہ طرزِ معاشرت اختیار کرنا کس قدر ضروری ہے۔ اس کی ذرا بھی بھول چوک، صبر وتحمل میں کمزوری، عدل وانصاف میں بے احتیاطی، خاندانی شیرازہ بندی کو تنکوں کی طرح بکھیرے کر رکھ دے گی۔ اسی طرح افرادِ خاندان میں قوتِ برداشت، ایثار وبے نفسی، قناعت پسندی اور اطاعت شعاری کا وصف لازم ہے۔ پھر شریعت کے احکام، صلہ رحمی، عفو ودرگزر، پردے اور حجاب کی پابندی، یہ سب ہر ایک کے لیے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس لیے خلاصہ کلام یہ ہے کہ سرپرست اور ماتحت دونوں ہر اعتبار سے دائرۂ احکام کے پابند ہوں، جو بڑے کلیجے اور حوصلے کا کام ہے، تو مشترکہ خاندانی نظام کو اولیت دی جائے گی اور یہ بڑی عظمت اور عزیمت کا کارنامہ ہو گا۔ اور اگر دونوں، یا دونوں میں کوئی ایک اپنے آپ کو اس معیار پر پورا اترتا نہ دیکھے تو اس کے لیے رخصت کی راہ کھلی ہوئی ہے:

جس کو ہو دین ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

علیحدہ علیحدہ مختصر کنبے جب ہوں گے تو میاں بیوی اور اولاد کے ساتھ گزر بسر رہے گی، سارے خاندان سے تعلقات بحال اور مستحکم رکھیں گے۔ ملاقاتوں کا سلسلہ، تحفے تحائف کا تبادلہ، ایک دوسرے کے دکھ سکھ سے واقفیت اور صلۂ رحمی کے تمام آداب کا پاس ولحاظ، عید برات، شادی بیاہ میں سب کا اجتماع، ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا اور دل کھول کر مادی اور اخلاقی تعاون میں پیش پیش رہنا، مشوروں میں شریک رہنا اور شریک کرنا، تبادلۂ خیالات میں کھلے دل سے دلائل کا وزن محسوس کرنا اور ایک دوسرے کی بات کو سر آنکھوں پر رکھنا اور ایسے ہی تمام اخلاق اصول وضوابط کے پابند ہوں تو دور رہ کر بھی مشترکہ خاندان کا ثبوت اور مثال پیش کر سکتے ہیں اور میری رائے میں یہی اندازِ معاشرت میل ملاقات اور الفت ومحبت میں زیادہ خوش گوار اور پائیدار رہے گا۔ کئی برتن جہاں مل کر رکھیں گے تو وہاں کھنک ضرور سنائی دے گی۔ کچھ انسان کی فطرت بھی تنوع کی خواہش مند ہے۔ ضرورت اور بلا ضرورت کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے تو اکتاہٹ اور بوریت سے آدمی محفوظ رہ سکتا ہے۔ روز روز کی ملاقات سے ناغے کی ملاقات محبت میں اضافے کا باعث ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے:

زرغبا تزدد حبا

وقفے وقفے سے ملاقات کرتے رہو، انتظار رہے تو ملاقات کا مزہ ہی کچھ اور ہے:

رہوں قریب تو موجودگی گراں گزرے
قریب رہ نہ سکوں تو کمی گراں گزرے
میں کچھ کہوں تو مری بات بارِ خاطر ہو
میں چپ رہوں تو مری خاموشی گراں گزرے

رہی اسلام کی پسند تو وہ میں نے بتا دی۔ مشترکہ خاندان عزیمت ہے اور علیحدہ گھرانہ رخصت ہے اور ہمارا دین کسی ایک ہی کو اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ حکمت ومصلحت اور اپنی طاقت وصلاحیت کو بہرحال مقدم رکھنا ہے۔ علیحدہ

گھروں کے لیے دلیل دی جائے تو عہدِ نبوت کے طرزِ معاشرت کو دیکھ لیجیے اور خود کاشانۂ نبوت میں ازواج مطہرات، امہات المؤمنین کے گھروں اور بودوباش کو الگ الگ دیکھ سکتے ہیں اور سورۂ نور کی یہ طویل آیت اس پر بہت کچھ روشنی ڈالتی ہے:

﴿أَن تَأْكُلُوا مِن بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خَالَاتِكُمْ﴾

"ضرورت پر تم اپنے گھروں سے کھالو، اپنے باپ دادا کے گھروں سے کھاؤ، اپنی ماؤں کے گھروں سے کھاؤ، اپنی بہنوں کے گھروں سے، چچاؤں پھوپھیوں کے گھروں سے، ماموؤں اور خالاؤں کے گھروں سے۔" (سورۃ النور: 61)

فہرست میں سب کے سب قریبی عزیز ہیں، ایک ہی خاندان کے افراد ہیں، مگر سب کے گھر علیٰحدہ علیٰحدہ ہیں اور چولہے ہانڈی بھی الگ الگ۔

اسلام کے بہت سے احکام کو مصالح کے پیشِ نظر مسلمانوں کی بالغ نظری، دور اندیشی، حکمت عملی اور مصلحت بینی پر موقوف رکھا ہے۔ اس کی مثالیں کئی ایک ہیں، مگر ان کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ بہر حال! مسلمانوں کے اتحاد واتفاق کو خلل انداز کرنے والا کوئی بھی کام غیر اسلامی عمل متصور ہوگا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت میں یہ اچھے احکام سب پر مقدم ہیں:

﴿ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ ﴾ (سورۃ الاعراف: 157)

"وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا، پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا، گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا، اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہوں گے، ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے۔"

اچھے کاموں کا حکم، برے کاموں پر روک، پاکیزہ چیزوں کو حلال، گندی چیزوں کو حرام، رسم ورواج کے بوجھ سے ہلکا کرنا، غلط فیصلوں اور فتووں کی زنجیروں سے آزاد کرنا، ناپسندیدہ عادات وروایات سے نجات دلانے ہی کے لیے تو اسلام دنیا میں آیا ہے اور اسی لیے یہ دین رحمت ہے، قانون بنانے والا رحمٰن ورحیم ہے اور اس دین کو لانے والا تمام جہانوں کی مخلوقات کے لیے رحمت ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (سورۃ الأنبياء: 107)

"اور (اے پیغمبر!) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

مولانا ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صبہا اعظمی عمری بھی دار البقاء کو کوچ کر گئے

مولانا ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صبا اعظمی عمری بھی دار البقاء کو کوچ کر گئے، جمعیت ابنائے قدیم جامعہ دار السلام عمر آباد کا اظہار تعزیت خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں صبہا عمری میں۔ نائب ناظم وشیخ الحدیث حکیم مولانا محمد عبد السبحان اعظمی عمری کے یہ فرزند طبیب کامل تھے۔ والد محترم جب سفر پر ہوں تو جامعہ کے مطلب میں بحیثیت حکیم وڈاکٹر اپنی خدمات انجام دیتے۔ زندہ دل انتہائی خود دار طبیعت کے مالک تھے، چند سال جامعہ میں بحیثیت انگریزی وریاضی استاد بھی رہے، گھڑی سازی کے فن میں بھی قدرت نامہ حاصل تھی اور گزر بسر کے لیے اسی پیشہ سے وابستہ ہو گئے۔ کمال درجہ کے شاعر تھے۔

علامہ محمد فیاض عادل فاروقی وفات پا گئے

علامہ محمد فیاض عادل فاروقی وفات پا گئے، مرحوم کی تدفین لندن میں کر دی گئی، علامہ محمد فیاض عادل 1971ء میں برطانیہ آئے اور اسلامی مرکز شمال غرب لندن میں خطابت اور فرقان انسٹیٹیوٹ میں تدریس کی مصروفیت میں رہے، انہوں نے مختلف ٹی وی چینلز پر لیکچرز کا سلسلہ، انٹروڈکشن آف اسلام کے علاوہ دینی و ادبی موضوعات پر اردو، انگریزی اور پنجابی میں تحریر اور تبصرہ کتب کا سلسلہ جاری رکھا، انہیں لندن بارو آف بارنٹ کی طرف سے سوک ایوارڈ، بزم شعر وادب یو کے کی جانب سے شیلڈ اور بزم غالب، پاک پنجاب ادب اینڈ کلچرل سوسائٹی، پنجابی ادبی سنگت، پنجابی لکھاری فورم اور دیگر ادبی تنظیموں کی طرف سے اعزازات ان اداروں کی ادب پروری کی دلیل ہیں۔

آج سے ٹھیک ایک سال قبل کوروناوائرس پر قابو پانے کے لیے لاک ڈاؤن لگایا گیا۔ مارچ 2020ء ساری دنیا کے لیے ایک آزمائش کا پیغام، انوکھی بیماری اور انجانا خوف لے کر طلوع ہوا، لوگ اپنے ہی گھروں میں محصور ہو کر رہ گئے۔ دنیا کا پہیہ جام ہو گیا۔ جدید ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی سست پڑ گئی۔ اپنے، بیگانے، قریبی ہمسایہ، سب پرائے دکھائی دینے لگے۔ تب ہی تو سلام کرنے میں تذبذب، مصافحہ کرنے میں تامل ہوتا تھا، بیماری اور موت کا خوف، ایسا کہ گھر کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے تردد ہو رہا تھا کہ کہیں باہر دیکھتے ہوئے خود ہی انجانی بیماری کا شکار نہ ہو جائیں۔

ٹی وی یا ریڈیو آن کیجیے تو ہر طرف موت کی خبریں، لاشیں بے گوروکفن سرد خانوں میں پڑی ہوئی، کوئی قریب جانے اور تجہیز وتکفین میں ہاتھ بٹانے کے لیے تیار نہیں، موت کی اطلاع کے ساتھ ہی جہاں غمگساروں اور ہمدردی کا وہ ہجوم امنڈ پڑتا تھا، اب متعلقین کی جانب سے ہی اعلان کیا جانے لگا کہ شخصی حاضری یا جنازہ میں شرکت کی زحمت نہ کیجیے، بس دور سے ہی بذریعہ فون اپنے جذبات یا ہمدردی کا اظہار کافی ہے اور اگر لواحقین کا دینی پس منظر ہو تو اس میں مزید اتنا اضافہ کہ دعا کر دیجیے۔

مساجد کے دروازے بند، نماز جنازہ پر قدغن، قبرستان جائیے تو گیٹ پر پہرے دار ایسی جانچ پڑتال اور گنتی کرے کہ گویا ہم قبرستان نہیں، ہیرے جواہرات کی دوکان میں داخل ہو رہے ہیں، آنے والے افراد کا میت کے ساتھ تعلق کا تعین، اور پھر قبرستان کے اندر داخل ہونے اور دفن کرنے کے آداب اور مشروط اجازت، اگر دوران گنتی مرنے والے کی اولاد یا پس ماندگان کا نمبر مقررہ عدد سے تجاوز کر رہا ہو تو بے مروتی سے گیٹ کے باہر ہی روک دیا جاتا کہ نماز جنازہ یا مراسم تدفین میں شرکت سے محرومی پر افسوس کرتے ہوئے قبرستان کے باہر انتظار کیجیے، اور قبرستان کے احاطہ میں ایسا سناٹا اور ہو کا عالم کہ اندر جانے والوں کا دل حلق میں اٹک اٹک کر رہ جائے۔

تازہ قبروں کی تعداد میں اضافہ اس تیزی سے کہ ہر ایک کو خود اپنی موت سامنے دکھائی دینے لگے۔ برمنگھم شہر کا سب سے بڑا قبرستان چند ہی دنوں میں تنگی داماں کا شکوہ کرنے لگا۔ مزید لاشوں کو بے گوروکفن چھوڑنے کے بجائے ہنگامی بنیادوں پر متبادل جگہ کونسل کی جانب سے فراہم کر دی گئی جو کہ بہت سوں کے لیے غیر مانوس اور دور افتادہ تھی۔

بعض نوجوانوں کے جذبہ ایثار اور دلیری کو سلام کہ اپنی جان جوکھم میں ڈال کر دوسروں کی تجہیز وتکفین میں نمایاں دکھائی دے رہے تھے، انہیں فرمانِ الٰہی پر بلا کا یقین کہ موت کا وقت مقرر ہے، کوئی مقررہ وقت سے ایک لمحہ پہلے مر نہیں سکتا اور نہ ہی ایک لمحہ کے لیے مزید زندگی پا سکتا ہے، ایسے خوفناک ماحول میں جہاں قریبی قریب جاتے ہوئے خوفزدہ تھے لیکن یہ رضاکار آگے بڑھ بڑھ کر غسل، کفن اور نماز جنازہ کا اہتمام کر رہے تھے۔

آج ایک سال بعد مارچ کا مہینہ لوٹ کر آیا، گویا اسی ہیبت ناک صورتحال میں ہم نے بارہ مہینے کاٹ دیے۔ درمیان میں عارضی طور پر لاک ڈاؤن کے قوانین میں نرمی کی گئی لیکن یہ بہت ہی وقتی ثابت ہوئی۔

یہ ایک ایسی وبا ہے کہ ایک برس گزرنے اور لاکھوں اموات کے باوجود ابھی تک اس کی حقیقت سے عوام تو عوام، خاص الخواص کو بھی شکوک و شبہات ہیں، حتیٰ کہ دنیا کے ترقی یافتہ ملک امریکہ کے سابق صدر ٹرمپ اس بیماری کے متعلق اپنے شبہات کا برملا اظہار کرتے رہے، انتخابی مہم کے دوران اپنے حریف جو بائیڈن کی احتیاطی تدابیر اور ماسک کے استعمال کے خلاف انہیں نشانہ تضحیک بناتے رہے۔

ان ہی نازک حالات میں گزشتہ رمضان کی آمد کا اعلان ہوا۔ رمضان کا مہینہ ایک مسلمان کے لیے ذکر واذکار اجر وثواب، توبہ واستغفار، رجوع الی اللہ اور تعلق بالقرآن کے اعتبار سے موسم بہار کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج کے اس دور پُر فتن میں بھی رمضان کی آمد کے ساتھ ہی مسلم دنیا میں ایمان وعمل کی بہار دکھائی دینے لگتی ہے۔ مردہ ضمیر اور مردہ دلوں میں بھی تقویٰ اور پرہیزگاری کے آثار محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ وہ لوگ جو کسی عذر شرعی یا قلت ایمان کی وجہ سے روزے نہ بھی رکھتے ہوں مگر ایمانی جھونکوں کے اثرات ان تک بھی کچھ ایسے پہنچتے ہیں کہ کم از کم ظاہری طور پر وہ بھی روزہ داروں کی نقل کرتے دکھائی دیتے ہیں، پبلک مقامات پر کھانے پینے اور معاصی سے احتراز کرنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم نے رمضان کا آغاز حسرت ویاس اور بیم ورجا کے ساتھ کیا کہ مسجدوں کے دروازے بند، حرمین شریفین جہاں رمضان میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی عوام کے لیے بند، تکمیل ضابطہ کے لیے ائمہ، مؤذنین اور چند کارگذاروں کو داخلہ اور صلاۃ کی اجازت اور اب بارہ ماہ گزرنے کے باوجود بھی صورتحال میں نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی، مساجد اور حرمین میں احتیاطی تدابیر پر عمل کرتے اور کرواتے ہوئے

محدود تعداد میں لوگوں کو داخلہ کی مشروط اجازت دی گئی۔ جن گھروں میں حفاظ یا علماء تھے انہوں نے اس طویل دورانیہ میں اپنے ہی گھروں کو مصلیٰ بنالیا۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے تذکرہ میں یہ اہم نکتہ بیان ہوا ہے کہ حالات سے جب مجبور ہو گئے تو انہیں گھروں کو ہی قبلہ بنالینے کا حکم دیا گیا۔

﴿وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾ (سورۃ یونس:87)

یہاں تو پابندیاں ایسی کہ اولاد، والدین کی زیارت سے محروم، قریبی بیگانے اور اپنے پرائے دکھائی دینے لگے، لاک ڈاؤن کا عملی تجربہ لوگوں کو پہلی مرتبہ ہو رہا تھا، یہاں تک کہ عید کا دن جو بجھے دلوں کو نئی توانائی بخشتا ہے۔ مرجھائے چہروں پر کچھ دیر کے لیے سہی فرحت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ انسان زندگی کی کلفتیں بھلا کر عید گاہ میں دوسروں کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ بغلگیر ہوتا ہے، مگر اس سال اس حسرت کے ساتھ گزر گیا کہ قریب رہتے ہوئے بھی دوری ہی رہی اور ہاسپٹلز میں صورتحال قابو سے باہر ایسی ہوئی کہ بیشتر مریضوں کو علاج معالجہ سے معذرت کی جانے لگی کہ اس وقت ترجیح اول صرف کورونا سے متاثرین ہیں اور پھر فوری آپریشن کے متقاضی بیمار بھی پیچھے دھکیل دیے گئے۔ ہمارے لیے فرمانِ نبوی ﷺ میں اہم ہدایت ہے کہ اپنی صحت کو بیماری سے پہلے غنیمت جانو:

«خُذْ مِنْ صِحَّتِكَ قَبْلَ سَقَمِكَ» (جامع ترمذی:2333)

یعنی صحت وتندرستی کے ایام میں نیک کام کر لو کہ بیماری میں پچھتاوا اور ندامت نہ ہو اور دنیا کی عشرت سے زیادہ آخرت کی کامیابی کو اپنی ترجیح بناؤ۔ کچھ لوگ اس وبا سے خوفزدہ ہو کر یا لاک ڈاؤن سے اکتا کر عارضی نقل مکانی کر کے خوشحال اور ترقی یافتہ ممالک سے پس ماندہ اور غریب ممالک میں گوشہ عافیت تلاش کرتے ہوئے نظر آئے اور پس ماندہ ممالک جو کبھی ان خوشحال ممالک کے پاسپورٹس کو دور سے ہی دیکھ کر داخلہ کی اجازت دے دیا کرتے، نہ ان کے لیے پیشگی ویزا کی شرط اور نہ ہی کوئی اجازت درکار تھی، اب وہ استفسار کر رہے ہیں کہ کیوں ہمارے ملک آنا چاہتے ہو، کتنے دن قیام کروگے اور کہاں پڑاؤ ڈالوگے وغیرہ وغیرہ؟؟ لیکن کیا کسی دوسرے علاقہ یا ملک جا کر موت سے بچنا ممکن ہے، موت کا اہلکار، کیا وہاں نہیں پہنچے گا:

﴿أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ﴾

"جہاں کہیں بھی رہو موت تمہیں دبوچ لے گی وقت مقررہ پر۔" (سورۃ النساء:78)

اسی اضطرابی اور غیر یقینی حالت میں رمضان نے دوبارہ دستک دی ہے۔ حساس اور غیور مسلمان تڑپ کر رہ گئے کہ رمضان دلوں کی بستیاں آباد کرنے کا مہینہ، خطا ونسیان سے پر بندوں کے لیے توبہ اور اصلاح کا مہینہ، بے عملی کی انسانی کھیتیوں کی روحانی آبیاری کا مہینہ پھر سے آ پہنچا مگر اب تو حالت یہ ہے کہ بہت سوں کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی ہیں، جو کبھی خاندان اور محفل کی شان ہوا کرتے، جو مساجد اور مجالس کی جان سمجھے جاتے وہ آج آسودہ خاک ہیں، اتنی اموات کہ موت کی خبر سے انسیت سی ہونے لگی ہے کہ ہر دن نئی خبر یعنی کسی کی موت کا گویا انتظار!

قرآن نے اسی حقیقت کی طرف ہمیں متنبہ کیا ہے کہ لوگوں کے حساب کی گھڑی قریب آ پہنچی ہے لیکن وہ منہ موڑ کر خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں:

﴿اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ﴾ (سورۃ الانبیاء:1)

پھر کیا ہو گا کہ موت کے ساتھ معاملہ ختم کر دیا جائے گا۔ نہیں، ایک نئی زندگی ابدی اور دائمی زندگی کا آغاز جس کا تمام تر دارومدار اس عارضی دنیوی زندگی کے اعمال پر منحصر ہو گا اور اللہ قادر مطلق کا وعدہ ہے کہ یہ ہو کر رہے گا۔

﴿كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَا ۚ إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ﴾ (سورۃ الانبیاء:104)

یہ وعدہ حق ہو کر رہے گا۔ دنیا کی رنگینیاں اور عشرت سامانیاں تمہیں یوم آخر سے غافل نہ کر دیں۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۖ وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ﴾ (سورۃ فاطر:5)

"ایسا نہ ہو کہ جب نامۂ اعمال آگے رکھا جائے تو ندامت سے چلانے لگیں کہ زندگی کا کوئی راز مخفی نہیں، ہر چھوٹی بڑی بات اس میں درج ہے۔ اب کیا ہو گا:

﴿ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۚ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا﴾ (سورۃ الکھف:49)

انسان خود اپنے نامۂ اعمال کو دیکھ کر شرمندگی اور افسوس سے خود اپنے ہاتھ چبا ڈالے گا کہ کاش میں رسول ﷺ کی پیروی کیا ہوتا، کاش میں ارشادات نبوی کے مطابق زندگی بسر کیا ہوتا، کاش میں فلاں اور فلاں کے پیچھے نہ چلتا۔

کاش میں دنیا کے بجائے آخرت کو بنانے کی فکر کرتا۔ (سورۃ الفرقان:27)

فرمانِ نبوی ﷺ ہے کہ تم دنیا کی زندگی ایسے بسر کرو جیسے ایک مسافر سرراہ کسی جگہ کچھ دیر ستانے کے لیے رکتا ہے۔ تازہ دم ہوتے ہی آگے چل پڑتا ہے، اس عارضی اسٹیشن کو اپنی منزل نہیں سمجھتا۔ اسی طرح یہ دنیا بھی مؤمن کی منزل نہیں:

«كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غرِيبٌ، أَوْ عَابِرُ سبِيلٍ» (صحیح بخاری:6416)

دنیا کا گزارہ تو فرمان نبوی ﷺ کی روشنی میں یوں بھی ہو سکتا ہے کہ صبح کی آنکھ کھلی تو گردونواح کا ماحول پر امن، جسم تندرست اور گھر میں بقدر

کفاف ایک روز کی غذا میسر ہو تو گویا کہ دنیا کا حصہ تمہیں مل گیا، اب آخرت کی فکر کرو۔

«مَنْ أَصْبَحَ مِنْكُمْ آمِنًا فِي سِرْبِهِ مُعَافًى فِي جَسَدِهِ عِنْدَهُ قُوتُ يَوْمِهِ فَكَأَنَّمَا حِيزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيرِهَا» (جامع ترمذی:2346)

ہمیں نہیں معلوم کہ اس حیات مستعار کے کتنے دن باقی رہ گئے، ہم نے بہت سوں کی سفر آخرت پر روانگی کی اطلاع دی اور اب کون ہماری اطلاع کب دینے والا ہے، جسم وجان کا رشتہ کب ٹوٹنے والا ہے، اٹھو خواب غفلت سے جاگو، نیند بہت ہو گئی، خالی جھولی کچھ نیکیوں سے بھر لو، دنیا، دھن دولت اسباب عیش اور متاع آرام سے نظریں پھیر کر قبر، حساب محشر کے لیے کچھ ذخیرہ کر لو کہ ادھر پروانہ اجل آیا اور ادھر دوسری دنیا کا حساب کھل گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے تاکید فرمائی، لذتوں کا خاتمہ کرنے والی موت کو ہر دم یاد رکھو: «أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ» (جامع ترمذی:2307)

ادھر عارضی دنیا کا حساب بند ہوا، ادھر دائمی دنیا کا حساب جاری ہوا لیکن دوسری دنیا کے حساب میں کچھ ہو گا تب وہی اندوختہ کام آئے گا۔ قبر کے تنگ وتاریک گڑھے میں منکر نکیر کے جوابات وہی دے سکے گا، جس نے ہدایت ربانی کے مطابق زندگی بسر کی ہو گی اور ایسے ہی باعمل لوگوں کے حق میں قبر جنت کی کیاری ثابت ہو گی، ورنہ آگ کا گڑھا، قطع نظر اس بات سے کہ کسے کس قبرستان میں جگہ ملی اور کسے کس خاک میں دبایا گیا، اور یہیں سے میدان محشر میں حاضری ہو گی، اس محشر کی گھڑی کا اگر انسان ہلکا سا تصور ہی کر لے کہ جب وہ اپنی تمام کمزوریوں کے ساتھ تمام تر قوت والے قادر مطلق رب العالمین کے حضور پیش ہو گا، جس کی ہولناکی کو دیکھ کر وہ چاہے گا کہ اگر بس چلے تو دنیا کے قریب ترین اور عزیز ترین رشتہ داروں کو عذاب میں جھونک کر اگر خود کو عذاب سے بچانا ممکن ہو تو کر گذروں، مگر یہ ممکن نہیں، یہاں تو ہر ایک کو اسی چیز کا بدلہ ملے گا جو وہ عارضی دنیا میں کرتا رہا۔

﴿يُبَصَّرُونَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ 0 وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ 0 وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ 0 وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنجِيهِ ﴾(المعارج:11-12)

اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْئَلُكُ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

الٰہی! ہمارے لیے دنیا اور آخرت میں عافیت عطا فرمائے اور اس رمضان کو گزشتہ رمضان سے بہتر بنائے۔

شب قدر

تازہ ہو جاتا ہے ایمان ویقیں آج کی رات

شاد وخرم نہ ہوں کیوں اہل زمیں آج کی رات ہے	جو مائل بہ کرم عرشِ نشیں آج کی رات
حاملِ دین بنے سرورِ دیں آج کی رات	جن پہ نازل ہوا قرآنِ مبیں آج کی رات
آج کی رات پہ قربان ہزاروں راتیں	صرف اک رات بس اک رات نہیں آج کی رات
بزمِ دنیا میں فرشتوں کی جماعت لے کر	رونق افروز ہیں جبریلؑ امیں آج کی رات
لیلۃ القدر ملی ہے تو غنیمت سمجھو	کیا ہر انسان کو ملتی ہے کہیں آج کی رات
مری شہ رگ سے ہے نزدیک مگر اے مولا	آمرے اور قریں اور قریں آج کی رات
پوچھتے کیا ہو شب قدر کی قدر و قیمت	آسماں بن گئی یہ سطحِ زمیں آج کی رات
خیر وبرکت بھی ہے انوار کی بارش بھی ہے	کتنی پُرکیف ہے اور کتنی حسیں آج کی رات
روزہ داروں کی مسرّت کو بڑھانے کے لیے	کھل گئے ہیں درِ فردوسِ بریں آج کی رات
آج کی رات شب قدر جو کہلاتی ہے	ہر خذف ریزہ ہے اک درّ ثمیں آج کی رات
روح کو ملتی ہے بالیدگیٔ فکر و نظر	تازہ ہو جاتا ہے ایمان ویقیں آج کی رات
بھر گیا گو ہر مقصود سے دامانِ طلب	شادماں ہو گیا ہر قلب حزیں آج کی رات
آج کی رات ہر اک ذرّہ ہے جو سر بہ سجود	خود بخود جھک گئی میری بھی جبیں آج کی رات

چاند سورج کو ضیا بخشی ہے جس نے حماد
خانۂ دل میں مکیں ہے وہ حسیں آج کی رات

حضرت ابوالبیان حماد عمری

آٹھویں حدیث:

عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى الْمَازِنِيِّ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: ((شَهِدْتُ عَمْرَو بْنَ أَبِي حَسَنٍ سَأَلَ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ زَيْدٍ عَنْ وُضُوءِ النَّبِيِّ ﷺ؟ فَدَعَا بِتَوْرٍ مِنْ مَاءٍ، فَتَوَضَّأَ لَهُمْ وُضُوءَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَأَكْفَأَ عَلَى يَدَيْهِ مِنْ التَّوْرِ, فَغَسَلَ يَدَيْهِ ثَلاثاً، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فِي التَّوْرِ، فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلاثاً بِثَلاثِ غَرْفَاتٍ, ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَغَسَلَ وَجْهَهُ ثَلاثاً، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فِي التَّوْرِ, فَغَسَلَهُمَا مَرَّتَيْنِ إلَى الْمِرْفَقَيْنِ ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فِي التَّوْرِ، فَمَسَحَ رَأْسَهُ، فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَأَدْبَرَ مَرَّةً وَاحِدَةً، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ)) .

وَفِي رِوَايَةٍ: ((بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ, حَتَّى ذَهَبَ بِهِمَا إلَى قَفَاهُ، ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتَّى رَجَعَ إلَى الْمَكَانِ الَّذِي بَدَأَ مِنْهُ)) . وَفِي رِوَايَةٍ ((أَتَانَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَأَخْرَجْنَا لَهُ مَاءً فِي تَوْرٍ مِنْ صُفْرٍ)) . التَّوْرُ: شِبْهُ الطَّسْتِ.

حدیث مبارکہ کا سلیس ترجمہ: "سیدنا حضرت عمرو بن یحییٰ المازنی سے روایت ہے کہ وہ اپنے باپ یعنی حضرت یحییٰ سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا، میں حضرت عمرو بن ابو الحسن کے ساتھ حاضر ہوا، انہوں نے یعنی حضرت عمرو بن ابو الحسن نے سیدنا عبد اللہ بن زید سے نبی کریم ﷺ کے وضو کے متعلق پوچھا تو انہوں نے پانی کا ایک برتن منگوایا۔ پھر ان کے لیے (بطور تعلیم) نبی ﷺ کے وضو کی طرح کا وضو کیا۔ پانی کے برتن سے پانی اپنے ہاتھوں پر انڈیلا اور ان کو تین بار دھویا، پھر اپنا ہاتھ پانی کے برتن کے اندر تین بار ڈالا اور تین چلوؤں سے کلی کی اور ناک میں پانی چڑھایا اور اس کو جھاڑا، پھر اپنا ہاتھ پانی کے اندر ڈالا اور اس سے اپنے چہرے کو تین بار دھویا، پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو پانی کے اندر داخل کیا اور کہنیوں سمیت دو بار دھویا، پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو پانی میں داخل کیا اور اپنے سر کا مسح کیا، دونوں ہاتھوں کو سر کے سامنے سے شروع کیا اور ان کو سر کے پچھلے حصے (گدی) تک ایک بار کیا، پھر اپنے دونوں پاؤں دھوئے۔"

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ سر کا مسح سر کے سامنے یعنی پیشانی کی طرف سے شروع کیا، یہاں تک کہ اس کو گدی تک لے گئے، پھر دونوں ہاتھوں کو واپس اسی جگہ پر لوٹایا، جہاں سے مسح شروع کیا تھا اور ایک صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور ہم نے آپ کے لیے تانبے کے برتن میں پانی پیش کیا۔ (متفق علیہ)

التور تھالی کے مشابہ برتن ہے۔

حدیث مبارکہ سے حاصل ہونے والے بعض مسائل واحکام

a تابعین کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس جانا اور پھر وہاں دین کے مسائل سیکھنا۔ اس میں بعد والوں کے لیے بھی سبق ہے کہ وہ اس طرح کے طرز کو اپنائیں۔

b خیر القرون کے لوگوں کا دین کی تعلیم و تربیت کا حریص ہونا۔

c ایسے شخص سے مسئلہ پوچھنا جس کو قرآن وحدیث کا زیادہ علم ہو جیسا کہ اس حدیث میں تابعی نے صحابی سے مسئلہ پوچھا۔

d عمل کے ذریعے سے تعلیم دینا، بعض دفعہ بعض عملی مسائل کی تعلیم زبان کے بجائے عملاً کر کے دکھانا زیادہ مفید اور بہتر ہوتا ہے۔

e تابعی کا صحابی رسول سے رسول اللہ ﷺ کے وضو کا پوچھنا، اس میں بعد والوں کے لیے بھی سبق ہے کہ وہ بھی دینی امور میں رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل کو تلاش کر کے ان کے مطابق اپنا عمل کریں۔

f وضو کے پانی کے لیے تھالی نما برتن کا استعمال کرنا اور پھر اس کے اندر ہاتھ ڈال کر پانی لینے میں کئی ایک حکمتیں ہیں، مثلاً اس طرح پانی کم استعمال ہوتا ہے اور پانی کے ضیاع یا اسراف سے انسان بچ جاتا ہے، اسی طرح اس عمل سے ان لوگوں کا بھی رد ہوتا ہے جو مستعمل پانی کو طاہر یا مطہر یعنی پاک یا پاک کرنے کی صلاحیت نہ رکھنے کا موقف رکھتے ہیں۔

g اگر پانی کے برتن کے اندر ہاتھ ڈال کر وضو یا غسل کرنا پڑے تو پہلے دونوں ہاتھوں کو دھو کر پھر داخل کرنا چاہیے جیسا کہ صحابی رسول نے عملاً کیا۔

h وضو میں کلی اور ناک میں پانی چڑھانا اور پھر اسے صاف کرنے کے لیے ایک ہی ہاتھ کے چلو کو استعمال کرنے کی مشروعیت کا بیان۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کے چلو میں پانی لیا جائے، آدھے پانی کو کلی کے لیے منہ میں ڈالا جائے اور آدھے کو ناک صاف کرنے کے لیے ناک میں ڈالا جائے اور پھر ناک کو بائیں ہاتھ سے جھاڑا اور صاف کیا جائے۔

i وضو کو ترتیب سے کرنا چاہیے، اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو بغیر ترتیب کے وضو کے اعضاء کو دھونے کے قائل ہیں۔

j چہرے کو ایک ہاتھ سے بھی دھونے کا جواز جیسا کہ اس حدیث میں ذکر ہوا، البتہ افضل

دونوں ہاتھوں سے ہے اور اسی طرح چہرے کو دھوتے وقت پہلے کلی اور ناک کو صاف کرنا۔

k وضو کے اعضا میں پہلا عضو وضو چہرہ ہے اور ابتدا میں ہاتھوں کے پہنچوں کو دھونا اعضاء وضو میں شامل نہیں ہے بلکہ وہ صفائی کے لیے ہے۔ البتہ چہرے کے بعد ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھونے کے حکم میں پہنچے ہاتھوں میں داخل ہیں اور اسی طرح ان کو دھونے کا حکم ہے جیسے باقی ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھونے کا ہے۔

l اعضاء وضو کے بعد دھونے کی تعداد کے مختلف ہونے کا جواز جیسا کہ صحابی رسول نے ہاتھوں کو دو بار دھویا۔ بعض اعضاء یا سبھی اعضاء وضو کو ایک ایک بار دھونے کا جواز صحیح حدیث سے ثابت ہے، البتہ دو دو بار ایک ایک بار سے زیادہ بہتر ہے اور افضل تین تین بار ہے۔ یاد رہے کہ تین تین بار سے زیادہ اعضا وضو کو دھونا اسراف ہے۔ اسی طرح بعض اعضاء وضو کو ایک بار بعض کو دو بار اور بعض کو تین بار دھونا درست اور ثابت ہے۔

m ایک حدیث کی مزید وضاحت دوسری حدیث میں ہونا، جیسا کہ اس حدیث میں سر کے مسح کا بیان ہے۔ اسی طرح کسی ایک ہی مسئلے پر ایک ہی حدیث سے ثبوت کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے۔ بعض احادیث بعض کی تفسیر کرتی ہیں، اسی طرح بعض مسائل بعض میں ذکر ہوئے ہیں اور بعض میں نہیں۔ لہٰذا کسی بھی مسئلہ کے ثبوت کے لیے اصل معیار صحیح حدیث کو بنانا چاہیے وہ چاہے مختلف رواۃ سے مختلف الفاظ میں بیان ہو۔

n پورے سر کا مسح کرنا ہی سنت سے ثابت ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں سے پیشانی کی طرف سے شروع کیا جائے اور سر کے پچھلے حصے گدی تک لے جایا جائے اور پھر وہاں سے واپس پیشانی کی طرف لایا جائے جہاں سے مسح شروع کیا گیا تھا۔

o سر کے چوتھائی یا بعض حصے کا مسح کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ سر پر پگڑی کی صورت میں پگڑی پر مسح کرنا سنت سے ثابت ہے۔

p ننگے پاؤں کو دھونا ہی مشروع ہے۔ ننگے پاؤں پر مسح کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ پاؤں پر موزوں اور جرابوں کی صورت میں مسح کرنا سنت سے ثابت ہے۔

q تانبے کے برتنوں کے استعمال کا بلا کراہت جواز۔

مولانا ابراہیم میرپوری کے سسر وفات پاگئے!

امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ مولانا محمد ابراہیم میرپوری کے سسر مولانا عبدالحمید صاحب بعمر 85 سال فیصل آباد، پاکستان میں وفات پاگئے۔ مولانا کئی مرتبہ برطانیہ بھی آئے تھے، وہ کامیاب استاد اور امام تھے، نیک سیرت و کردار کے خوش خلق تھے۔

آج سے تقریباً 9 برس قبل کسی بھی قسم کی قربانی کا عزم لے کر اسلام کو گلے لگانے والی برمنگھم کی رہائشی خوش قسمت سمیہ، جس کی جنونی تڑپ نے اس کی بیٹی، دو بیٹیوں اور خاوند کو بھی کلمہ پڑھنے پر مجبور کر دیا، کی نہایت ایمان افروز اور سبق آموز داستان قارئین کے پیش خدمت ہے۔

اگرچہ انٹرویو صرف سمیہ کا کرنا مقصود تھا مگر اس کی خواہش تھی کہ اس کی فیملی کے دیگر افراد کو بھی اس نیکی میں شامل کیا جائے، چنانچہ اسلامی حجاب میں ملبوس سمیہ اپنی باحجاب بیٹی اور مکمل باریش خاوند کے ساتھ انٹرویو کے لیے حاضر ہوئی جبکہ اس کے دونوں بیٹے بوجوہ خود تو نہ آسکے مگر ان کی والدہ نے ان کی نیابت کر دی۔ لہٰذا یہ انٹرویو سہ رکنی اور گزشتہ انٹرویوز سے مختلف ہے۔ تاہم امید ہے کہ قارئین اسے یقیناً مفید پائیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز

ص: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

س: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ص: بہن! آپ کا پیدائشی نام کیا ہے؟

س: میرا پیدائشی نام Rachel Wadrup (راچل وڈرپ) ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد میں نے اپنا سمیہ پسند کیا ہے۔

ص: آپ کی عمر کیا ہے؟

س: میری عمر 45 سال ہے۔

ص: کیا آپ کوئی کام کاج یعنی ملازمت وغیرہ کرتی ہیں؟

س: اصل کام تو گھر سنبھالنا ہے مگر میں چونکہ Florist (گُل فروش) ہوں، اس لیے گجرے اور گل دستے بنانا میرا محبوب مشغلہ ہے۔

ص: آپ کے خاندان میں اب تک کون کون مسلمان ہو چکا ہے؟

س: میری ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں، وہ سبھی مسلمان ہو چکے ہیں، خاوند بھی مسلمان ہو گئے ہیں۔ الحمدللہ ایک بڑی بہن اور تین چھوٹے بھائی ہیں وہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے مگر کوشش ہماری ہے، اگر ان کے مقدر میں ہدایت ہوئی تو اللہ تعالیٰ انہیں ضرور سیدھا راستہ دکھا دیں گے، البتہ ایک چھوٹا بھائی بہت حد تک اسلام کی طرف مائل ہو چکا ہے، مجھے اللہ کی رحمت کی امید ہے کہ وہ عنقریب مسلمان ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ

میرے والد کیتھولک عیسائی تھے اور دو سال قبل وفات پا چکے ہیں۔ والدہ ابھی زندہ ہیں مگر وہ کسی بھی مذہب کی پیروکار نہیں ہے، اللہ انہیں ہدایت عطا فرمائے۔

ص: اسلام کی طرف آپ کا سفر کب اور کیسے شروع ہوا؟

س: میرے خیال میں اس سفر کا آغاز تو بچپن ہی سے ہو چکا تھا، جب میری خالہ، جو کہ عیسائی فرقے یہوداوِٹنسز سے منسلک تھیں، مجھے کبھی کبھار اپنے ساتھ چرچ لے جایا کرتی تھیں۔ مگر میں فطرتی طور پر ایک اللہ ہی کو مانتی تھی اور اسی سے دعا کرتی تھی، پھر جب میری شادی ہو گئی اور میرے ہاں اولاد ہونے لگی تو میں نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ میں حسب استطاعت ان کی اچھی تربیت کروں گی، کیونکہ میں یہ اعتقاد رکھتی تھی کہ اولاد اللہ ہی کی عطا کردہ نعمت ہے۔ میرا سب سے بڑا بیٹا، جو اب پچیس سال کا ہے۔ جب دس سال کی عمر کو پہنچا تو اسے دمہ کی سخت تکلیف ہو گئی۔ حتیٰ کہ ڈاکٹرز نے کہہ دیا تھا کہ اس کے زندہ بچنے کی امید نظر نہیں آتی، مگر میں اس کی صحت یابی کے لیے بہرحال مسلسل دعائیں کرتی رہی، بالآخر وہ شفایاب ہو گیا، میں نے سوچا کہ مجھے تو اب اپنے خالق کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اس کی عبادت پہلے سے زیادہ لگن سے کرنی چاہیے۔

ص: آپ بار بار الٰہ اور خالق کی بات کر رہی ہیں تو کیا اس وقت اس سے آپ کی مراد تثلیث (یعنی اللہ، عیسیٰ اور روح القدس تینوں مل کر خدا ہیں) ہوا کرتی تھی؟

س: نہیں، میں فطرت سلیمہ کے مطابق صرف ایک الٰہ کو مانتی تھی۔ عقیدہ تثلیث تو کبھی میری سمجھ میں آیا ہی نہیں تھا، بس یہ جانتی تھی کہ ہمیں پیدا کرنے والی اور رزق عطا کرنے والی ایک ذات ہے جو ہماری عبادت اور دعاء وپکار کی حقدار ہے۔

بہرکیف جب میرا بیٹا صحت یاب ہو گیا تو میں اس قدر خوش ہوئی کہ مکمل دل لگی سے عبادت کی ٹھان لی۔ میں نے اپنی اس دلی تمنا کا اظہار ایک سہیلی کی والدہ سے کیا جو عیسائی تھی اور اکثر وبیشتر چرچ جایا کرتی تھی، اس نے مشورہ دیا کہ مجھے چرچ کی اجتماعی عبادت میں باقاعدگی سے شرکت کرنی چاہیے۔ چنانچہ میں نے پابندی کے ساتھ چرچ جانا شروع کر دیا اور گاہے بگاہے اپنے بچوں کو بھی ساتھ لے جاتی۔ کبھی کبھار میرے خاوند بھی چرچ جاتے، اس کے ساتھ ساتھ میں نے بائبل کا مطالعہ بھی شروع کر دیا، میں جوں جوں اسے پڑھتی جاتی میرے ذہن میں اٹھنے والے سوالات بڑھتے جاتے جن کا کہیں سے جواب نہ ملتا۔ پادری سے یا کسی اور سے کبھی اپنی ذہنی تشویش کا اظہار کرتی تو ایک ہی جواب ملتا کہ ”خوامخواہ سوالات نہیں کرنے چاہئیں بلکہ جو کچھ بتایا جائے اسے آنکھیں بند کر کے مان لینا چاہیے“ مگر میں سوچتی تھی کہ میرے رب نے مجھے عقل اور سوجھ بوجھ کس لیے دی ہے؟ میں کسی کی اندھی تقلید کیوں کروں؟ تقریباً سات سال تک میں اس الجھن کا شکار رہی

مگر کوئی حل نظر نہ آتا تھا۔ رب کی عبادت کو دل چاہتا تھا مگر سوچ کا الجھاؤ ضمیر کو بے قرار رکھتا تھا، بالآخر میں دل برداشتہ ہو کر چرچ سے دور ہونے لگی، میرے ساتھ میرے خاوند بھی کچھ ایسی ہی کشمکش کی وجہ سے مذہب سے دور ہو گئے، آپ مزید تفصیلات ان سے خود پوچھ سکتے ہیں۔ بہر حال ہمارے پڑوس میں ایک مسلمان فیملی رہتی تھی جو بہت بااخلاق اور نہایت ہمدرد تھی، ان کا ہمارے ساتھ سلوک نہایت اچھا اور خیر خواہانہ تھا۔ میں نے رفتہ رفتہ اپنی ہمسائی کے ساتھ اپنے ذہنی خلفشار کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ میں اس سے اس کے ایمان اور عقیدے کے بارے میں بھی پوچھتی اور وہ مجھے اللہ اور محمد ﷺ کے بارے میں بہت سی باتیں بتاتی، میں شوق سے اس کی باتیں سنتی۔ اس نے مجھے سیدنا عیسیٰ کی بابت اپنے عقیدے کے بارے میں بھی بتایا، عیسائی ہونے کے ناطے میرے دل میں عیسیٰ کی محبت تو تھی ہی اس کی باتیں سن سن کر میرے دل میں محمد ﷺ کی محبت بھی پیدا ہو گئی۔

ص: کیا اس نے آپ کو پڑھنے کے لیے بھی کچھ دیا؟

س: جی ہاں! میری دلچسپی بھانپ کر اس نے مجھے انگلش ترجمے والا قرآن مجید دیا تھا، میں نے جب اسے ابتداء سے پڑھنا شروع کیا تو دوسرے ہی صفحے پہ سورۃ البقرہ کی آیت مبارکہ ﴿ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ "یہ وہ عظیم کتاب ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔" نے میری آنکھوں سے گویا پردہ اٹھا دیا۔ اس ضمانتی بیان کا چیلنج اور گارنٹی نے میرے دل کو ایسا یقین عطا کیا کہ آج تک اس کا رسوخ میں محسوس کرتی ہوں، بلکہ جب کبھی اس کے بارے میں سوچتی ہوں تو میری دلی کیفیت ناقابل بیان ہو جاتی ہے (یہ باتیں کرتے ہوئے سمیہ کی آواز تھر تھرانے لگی اور اس کی آنکھوں میں شکرانے کے آنسو تیرنے لگے) دورانِ مطالعہ میں سورۃ مریم بہت شوق سے پڑھتی تھی اور بسا اوقات اس کی تلاوت بھی سنتی۔ میری بیٹی مجھ سے کہتی کہ "امی آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟' یہ درست نہیں ہے۔ آپ عیسائی ہو کر کسی اور مذہب کی کتاب کیونکر پڑھ سکتی ہیں؟" میں کہتی کہ "نہیں! یہ اسی رب کا کلام ہے جس کی ہم عبادت کرتے ہیں اور جس سے سب کچھ مانگتے ہیں۔"

قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کے دوران دو ہفتوں کے اندر اندر میرا دل مکمل طور پر مطمئن ہو چکا تھا کہ یہ کتاب ہی میری سب الجھنوں کا حل ہے۔ پھر ایک دن میں نے اپنے شوہر سے ذکر کیا کہ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو کیا خیال ہے؟ وہ میری بات سے چونک اٹھے اور بولے کہ "اگر تم نے ایسا کیا تو وہ ہمارے ازدواجی رشتے کا آخری دن ہو گا۔ یہ قطعاً ناقابل قبول ہے۔ تم ایسا ہر گز نہیں کرو گی۔" وہ اگرچہ خود بھی چرچ سے دور ہو چکے تھے مگر میرے یا اپنے مسلمان ہونے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

بہر حال میرے سامنے تو حق بالکل عیاں ہو چکا تھا اور میں ایسے ٹھکرانے سے یکسر قاصر تھی۔ میری زندگی بھر کے سوالات (مثلاً انسان کی تخلیق کا کیا مقصد ہے؟ کائنات کی تخلیق کیوں ہوئی؟ مرنے کے بعد کیا ہو گا؟ وغیرہ) کے اطمینان بخش جوابات مل چکے تھے۔ اپنے شوہر سے بات کرنے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد میں نے اپنی ہمسائی کو فون کیا اور اس سے کہا کہ ازراہ عنایت جس مسجد میں آپ جاتی ہیں مجھے بھی ساتھ لے چلیے، میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔ وہ کہنے لگی: ٹھہرو، ٹھہرو! تمہارے اپنے خاوند کے ساتھ تعلقات بہت اچھے ہیں۔ اتنا بڑا اقدام کرنے سے پہلے انہیں اعتماد میں لو اور ان کی رائے بھی معلوم کرو تا کہ تمہیں بعد میں بڑی پریشانی کا سامنانہ کرنا پڑے۔ میں نے کہا: میں آپ کے کہنے سے پہلے اپنے شوہر سے اس خواہش کا اظہار کر چکی ہوں اور ان کی رائے بھی جان چکی ہوں۔ انہوں نے اگرچہ سخت ناپسندیدگی دکھائی ہے مگر مجھے بہر صورت اپنے خالق ومالک رب کی بات ماننی ہے نہ کہ خاوند کی۔ یہ معاملہ میرے اور میرے رب کے درمیان ہے۔ کل روزِ قیامت مجھے خود اپنی زندگی کا حساب دینا ہو گا۔ میرا خاوند یا کوئی اور مجھے کچھ فائدہ نہیں دے سکے گا۔ لہٰذا خاوند کی خوشنودی کی خاطر میں اپنے رب کی ناراضی مول نہیں لے سکتی۔" اس نے جب میرا اصرار دیکھا تو مجھے مسجد لے جانے کے لیے تیار ہو گئی اور پھر چند گھنٹوں کے بعد ہم گرین لین مسجد میں پہنچ گئے جہاں میں نے کلمہ شہادت پڑھ کر اسلام قبول کر لیا۔ الحمدللہ۔ اس واقعہ کو نو برس بیت چکے ہیں۔ یہ 2008 کی بات ہے۔

ص: اس موقع پہ آپ کو خوشی تو بہت ہوئی ہو گی؟

س: مجھے یوں لگا کہ، جیسے میرے کندھوں سے بہت بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔ سورۃ اعراف کی آیت نمبر 157 میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے اوصاف حمیدہ اور نبوی ذمہ داریوں میں اس بات کا ذکر بھی کیا ہے کہ آپ لوگوں کے کندھوں سے خود ساختہ رسوم ورواج کے بوجھ ہٹاتے اور ان کی گردنوں میں پڑے سماجی اور مذہبی وڈیروں کی غلامی کے طوق اتار پھینکتے ہیں) میں نے خود کو بہت ہلکا محسوس کیا اور دل میں ایسی فرحت اور شادمانی پھوٹ اٹھی کہ اس سے پہلے کبھی اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔ پھر جب میں گھر واپس لوٹی تو شوہر کا ردِّ عمل دیکھنے کے لیے ان سے پوچھا کہ "اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو؟' میرے چہرے کی تروتازگی اور آنکھوں سے چمکنے والی مسرت کا اندازہ کر کے انہوں نے برجستہ کہا: "مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہارا طرزِ گفتگو پتہ دیتا ہے کہ تم مسلمان ہو چکی ہو۔"

ص: کیا انہوں نے قطع تعلق نہیں کیا، جیسا کہ وہ پہلے آپ کو دھمکی دے چکے تھے؟

س، دو ہفتے وہ مجھ سے ناراض رہے اور میرے ساتھ گفتگو نہیں کی۔ مگر سچ یہ ہے کہ مجھے ان کی ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میں کسی بھی قسم کی قربانی دینے کے لیے ذہنی طور پہ تیار تھی اور اسی لیے میں نے اپنا نیا نام سب سے پہلی شہیدہ اسلام سیدہ سمیہ کی بے مثال ثابت قدمی کی داستان

پڑھ کر رکھا تھا۔ تاہم میری دلی تڑپ تھی کہ میرا سارا گھرانہ مسلمان ہو جائے۔ اس لیے دعوت کا آغاز کرنے کی نیت سے میں نے اپنی بیٹی کو اپنے مسلمان ہونے کی خبر دی۔ وہ پہلے تو سخت ناراض ہوئی کہ آپ خو ہی تو ہمیں چرچ لے جاتی تھیں اور ہمیں عیسائیت کا درس دیتی تھیں۔ اب آپ نے اپنا دین تبدیل کر لیا ہے۔ یہ آپ کا فیصلہ درست نہیں ہے، میں نے اسے سمجھایا اور اسے حدیث کی کتاب ریاض الصالحین جو انگلش میں مترجم تھی اور گرین لین مسجد سے مجھ ہدیۃً ملی تھی، اسے پڑھنے کے لیے دی اور اس سے کہا کہ "اسے پڑھ کر خود فیصلہ کرو کہ اس میں جو باتیں مذکور ہیں وہ درست ہیں یا نہیں" اس سے اگلی بات آپ خود اس سے پوچھ لیں۔

(اس کے بعد انٹرویو کے چند سوالات سمیہ کی بیٹی سے کیے گئے اور اس نے اپنے قبول اسلام کی روداد سنائی)

ص: آپ کا پیدائشی نام کیا ہے؟

ع: میرا اصل نام Candice (کینڈیس) ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے 'عالیہ' نام منتخب کیا ہے۔

ص: آپ کی عمر کیا ہے؟

ع: اس وقت میری عمر 23 سال ہے۔ جب مسلمان ہوئی تھی تب میری عمر 14 سال تھی اور سکول میں پڑھتی تھی۔

ص: کیا گھر میں والدہ کے بعد مسلمان ہونے والی آپ ہی تھیں؟

ع: جی ہاں

ص: آپ کو کس چیز نے اسلام کی طرف راغب کیا؟

ع: بچپن میں ہم والدہ کے ساتھ چرچ جایا کرتے تھے مگر جب انہوں نے جانا چھوڑ دیا تو ہم نے بھی چھوڑ دیا جبکہ اس کی وجہ والدہ نے کبھی نہیں بتائی نہ ہم نے پوچھی۔ البتہ ذہن میں یہ بات راسخ تھی کہ ہم عیسائی ہیں اور یہی سچا مذہب ہے۔ جب والدہ نے اسلام قبول کیا تو مجھے سخت پریشانی ہوئی۔ پھر انہوں نے مجھے سمجھایا اور مطالعہ کے لیے مترجم ریاض الصالحین دی۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو ایک ایک حدیث میرے دل میں نہ صرف اترتی گئی بلکہ اسے نور سے بھرتی گئی۔ میری آنکھوں سے حجاب یوں اٹھتے گئے گویا میں کسی اور جہاں کی طرف رخ کیے ہوئے ہوں۔ میں ان احادیث کی اس قدر شیدائی ہوئی کہ رات گئے تک پڑھتی رہی۔ آخر ایک شام میں نے اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو وقت گزرتے گزرتے رات دو بجے کا ٹائم آ پہنچا۔ میں اس کے مطالعہ میں ایسی مگن ہوئی کہ وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ بالآخر صورت حال یہ ہو گئی کہ میرے آنسو تھے جو تھمتے نہ تھے! میں والدہ کے کمرے میں گئی اور ان سے کہا کہ "امی! ایسی خوبصورت اور پُر تاثیر باتیں تو میں نے کبھی کسی کتاب میں پڑھی ہیں نہ کبھی کسی سے سنی ہیں، انہوں نے تو میرا دل موہ لیا ہے" میں صرف ایک حدیث بطور مثال ذکر کرتی ہوں، جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ "پانچ وقت نماز پڑھنے والا گناہوں سے ایسے پاک صاف ہو جاتا ہے، جیسے وہ شخص جس کے دروازے پہ نہر بہتی ہو اور وہ ہر روز پانچ بار اس میں نہائے جس کے نتیجے میں اس کے بدن پہ کوئی میل کچیل نہ بچے۔" میں اگرچہ اسلام کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی مگر اس بات سے واقف تھی کہ مسلمان ایک دن رات میں پانچ بار نماز پڑھتے ہیں، جبکہ اس کے ماوراء فلسفے اور حکمت سے نا آشنا تھی بلکہ تعجب کناں بھی تھی۔ جب یہ حدیث پڑھی تو میرے تحیر کا عقدہ کھل گیا اور دل نے فوراً صدا دی کہ پنج وقت نماز کی اس سے بہتر اور عمدہ مثال کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ الغرض میں نے والدہ سے کہا کہ "میں مسجد جا کر دیکھنا چاہتی ہوں کہ مسلمان نماز کیسے ادا کرتے ہیں۔ آپ کسی روز مجھے ساتھ لے چلیے۔" چنانچہ اگلے ہی روز والدہ مجھے گرین لین مسجد لے گئیں۔ جب ہم مسجد کے دروازے پہ پہنچے تو اذان شروع ہو چکی تھی۔ اُدھر اذان کی آواز کانوں سے ٹکرائی اور اُدھر ضمیر نے جھنجوڑا کہ اس سے بڑھ کر سچائی اور کہاں ملے گی۔ چنانچہ میں نے اسلام کی آغوش میں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ سوموار کا دن تھا، اس کے دو دن بعد بدھ کے روز دوبارہ مسجد میں آ کر کلمہ پڑھ لیا۔ الحمد للہ، کلمہ شہادت پکارتے ہی دل خوشی سے جھوم اٹھا اور اس قدر مسرت روح پہ طاری ہوئی کہ میں الفاظ میں اسے کبھی بیان نہیں کر سکتی۔ گویا مجھے کائنات کا قیمتی ترین تحفہ مل گیا تھا۔

ص: آپ نے والدہ کے مسلمان ہونے کے کتنا عرصہ بعد اسلام قبول کیا؟

ع: دو ہفتے بعد

ص: آپ اس وقت نو عمر تھیں۔ کیا اپنی سہیلیوں یا کلاس فیلوز کے طعنوں اور تنقید کا ڈر دل میں نہیں آیا؟

ع: ڈر تو نہیں تھا۔ البتہ ہچکچاہٹ تھی، اسی لیے میں نے پہلے کچھ دن تو کسی کو بتایا ہی نہیں۔ پھر میری ایک مسلمان کلاس فیلو لڑکی تھی، جس کا نام اقرا تھا، اس پہ اعتماد کرتے ہوئے میں نے بطور راز اسے بتایا کہ میں مسلمان ہو چکی ہوں، وہ اس قدر خوش ہوئی کہ اس نے گھر جا کر اپنے والدین کو بتایا اور پھر مجھے دعوت پہ بھی بلایا۔ میں نے اس سے سکارف پہننے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے مجھے ایک سکارف تحفۃً دے دیا۔ میں سکول کے لیے گھر سے نکلتے وقت اسے پہن لیتی مگر سکول داخل ہونے سے پہلے اتار دیتی تھی۔ پھر چھٹی کے وقت سکول سے نکل دوبارہ پہن لیتی تھی۔ ایک روز صبح سکول جاتے ہوئے اقرا میرے گھر آئی تو میں نے اسے کہا کہ 'میں آج سکارف پہن کر سکول جانا چاہتی ہوں۔" اس نے میرے اس اقدام کو سراہا اور میرا حوصلہ بڑھایا اور میں نے سکارف پہن لیا۔ جب کلاس میں پہنچی تو ٹیچر کہنے لگی کہ یہ سکارف اتار دو۔ میں نے ہمت باندھتے ہوئے کہا: "نہیں! میں اسے نہیں اتاروں گی کیونکہ میں مسلمان ہو گئی ہوں۔" پہلے تو اس نے سمجھا کہ میں مذاق کر رہی ہوں مگر جب اس کے اصرار کے باوجود میں مسلسل انکار کرتی گئی تو اس کے حیرت سے ملے جلے طیش میں اضافہ ہو گیا حتی کہ اس نے میرے بڑے بھائی کو فون کر

کے شکایت بھی کی لیکن اس نے کوئی رد عمل نہیں دکھایا بلکہ یہ کہا کہ یہ اس کی اپنی پسند اور مرضی ہے، ہم اسے کچھ نہیں کہہ سکتے۔" ٹیچر کے علاوہ ایک دو لڑکوں نے بھی میرے ساتھ بد تمیزی کی۔ ایک نے میرے سر پہ مارا اور دوسرے نے میرا سکارف کھینچ اتارنے کی کوشش کی، اسی طرح کچھ لڑکیاں بھی میرے ساتھ ناروا سلوک کرتیں، مگر میں نے اللہ کی توفیق سے ان چیزوں کی پروا نہیں کی اور اپنی تعلیم جاری رکھی، تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے 2013ء میں ایک صومالی مسلمان سے شادی کی، جس سے اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بیٹی عطا کی ہے۔

ص: آپ کے بعد پھر کس نے اسلام قبول کیا؟

ع: میرے بڑے بھائی Kurtis (کرٹس) نے، جس کا نام اب 'زید' ہے۔ (اس کے بعد سمیہ اپنے بیٹے کے بارے میں بتانے کے لیے بولی) جب عالیہ نے اسلام قبول کر لیا تو اس کے چند روز بعد میں نے اپنے بیٹے سے، جس کی عمر اس وقت سولہ سال تھی، کہا کہ "بیٹا! میری خواہش ہے کہ تم بھی دین اپنالو، اس نے کہا: "امی! آپ جو راستہ اختیار کریں میں آپ کے پیچھے ہوں، کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ آپ اپنے لیے یا میرے لیے کسی غلط راہ کا انتخاب نہیں کر سکتیں۔" میرا چھوٹا بیٹا Clayton (کلے ٹن) جو کہ اب حمزہ ہے۔ اس وقت 9 سال کا تھا۔ میں اس کے بارے میں فکر مند تھی کہ اسے اسلام کے بارے میں کیسے بتاؤں۔ میں نے مسجد میں فون کر کے پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ دونوں بیٹوں کو اسلام کا تعارف اور اس کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ کرنا چاہیے اور اگر وہ خوشی سے قبول کریں تو انہیں مسجد لے جا کر کلمہ پڑھوا دوں۔ بالآخر وہ دونوں بھی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ ان کے اور عالیہ کے کلمہ پڑھنے میں صرف ایک ہفتے کا وقفہ تھا۔

پھر میں نے اپنے خاوند سے کہا کہ "دیکھیں! آپ کے سوا گھر میں سب مسلمان ہو چکے ہیں، آپ کو بھی اس کے بارے میں سوچنا چاہیے۔" اس کے ساتھ ساتھ میں ان کے لیے دعا بھی کرتی کہ اللہ ان کا سینہ کھول دے اور انہیں ہدایت عطا فرمائے۔

(اس کے بعد چند سوالات سمیہ کے خاوند سے کیے گئے۔)

ص: آپ کا اصل نام کیا ہے؟

ا: میرا پیدائشی نام Darren Gibbs (ڈیرن گبس) ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد میرا نام ابراہیم ہے۔

ص: آپ کی عمر اور پیشہ کیا ہے؟

ا: میری عمر 46 سال ہے اور میں معمار (مستری) ہوں۔

ص: آپ کیسے مسلمان ہوئے، آپ نے تو اپنی بیوی کو دھمکی دی تھی کہ اگر وہ مسلمان ہوئی تو آپ کا رشتہ ختم ہو جائے گا۔

ا: جیسا کہ سمیہ نے بتایا ہے کہ اس کی طرح میں بھی چرچ سے متنفر ہو گیا تھا، مگر میں نے اس کے بعد کوئی متبادل راستہ اختیار کرنے کی پروا نہیں کی۔ بس اپنے کام سے کام رکھا۔ پھر جب گھر میں درجہ بدرجہ تبدیلی آئی تو میں جی ہی جی میں ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ ایک طرف بیوی بچوں کا مسلمان ہونا اور دوسری طرف دل و دماغ پہ چھایا تصور کہ عیسائیت ہی تو اصل دین ہے۔ جسے بچپن سے اب تک جانا اور مانا ہے۔ ایک خیال آتا کہ مسلمان ہو جاؤں تو دوسرا خیال آتا کہ انگریز کے لیے عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کر لینا بھلا کیونکر ممکن ہے؟ دن رات یہی خیالات دل کو مضطرب رکھتے۔ چنانچہ ایک روز کام پہ کچھ ہم پیشہ مسلمانوں سے میں نے خود ہی اپنی حیرانی اور کشمکش کا تذکرہ کیا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ انہوں نے بڑے حکیمانہ انداز سے جواب دیا کہ "اسلام قبول کرنا یا نہ کرنے کا تمہاری اپنی مرضی ہے لیکن تمہیں اس کے بارے میں کچھ پڑھنا ضرور چاہیے تاکہ تم خود فیصلہ کرنے کے قابل ہو سکو۔ میں نے ان کا مشورہ مانا اور اسلام کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ جوں جوں پڑھتا گیا، سینہ کھلتا گیا بالآخر اللہ تعالیٰ نے ہدایت نصیب فرما دی۔ ایک روز اپنے گھر میں دو چار مسلمان دوستوں کو بلا کر ان کے سامنے کلمہ پڑھ لیا۔ میرے اور سمیہ کے مسلمان ہونے میں چار ماہ کا وقفہ تھا۔ میں اللہ کا بے حد شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ہمارے سارے گھرانے کو اسلام کی دولت عطا فرمادی۔

ص: الحمد للہ! اللہ تعالیٰ آپ سب کو ثابت قدمی عطا فرمائے۔ آمین (سمیہ سے مخاطب ہوتے ہوئے) بہن! آپ سے دو مزید سوال کر کے انٹرویو ختم کرتے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آپ ہمارے قارئین کو کیا پیغام دینا چاہیں گی؟

س: میرا پیغام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بغیر کسی مشقت کے ایمان کی دولت عطا فرمائی ہے تو اس کی قدر کریں، ناقدری نہ کریں۔ ایمان سے کہوں تو ہماری زندگی بالکل بے کار ہے۔ مغربی تہذیب اور ماحول کے باسی ہونے کے ناطے ہم بخوبی جانتے ہیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو احساس کمتری کا شکار ہونے کی بجائے اور للچائی نظروں سے مغرب کو دیکھنے کی بجائے اپنے دین کو دیکھنا چاہیے کہ ان کے پاس وہ عظیم دولت ہے جس سے مغربی معاشرے محروم ہیں اور ان کی یہ محرومی قابل رحم ہے۔

ص: آخری سوال آپ سے یہ ہے کہ بطور مسلمان آپ کی سب سے بڑی تمنا کیا ہے؟

س: (سمیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں اور بولی) اللہ نے ہمیں اسلام کی نعمت عطا فرمادی ہے، ہمیں اس رب سے اور کیا چاہیے۔ اب بس یہی خواہش ہے کہ موت بھی اسی پہ آئے اور اللہ ہم سے خوش ہو جائے۔ تاہم ایک دینی تمنا یہ ہے کہ اللہ کا گھر دیکھ لیں اور جلد سے جلد حج کر لیں۔ اس کے لیے ہم دونوں میاں بیوی رقم جمع کر رہے ہیں اگر مطلوبہ رقم پوری ہو گئی تو اسی سال حج کرنے چلے جائیں گے۔ ان شاء اللہ

سیدنا ضرار بن ازور اسدی رضی اللہ عنہ کے اشعار سن کر رسول اکرم ﷺ مسکرا اٹھے

سر زمین خیبر کا دولت مند، آسودہ حال، خوبصورت، بہادر، جوان مرد، کڑیل جوان، بنو اسد قبیلے کا شہزور، دلاور، شمشیر زنی، نیزہ بازی، تیر اندازی اور گھڑ سواری کا ماہر شہسوار، رومیوں کے لشکر میں چشم زدن میں بھگدڑ مچا دینے والا بے خوف مجاہد، ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل قیمتی گلے کی ملکیت رکھنے والا، دھاک بٹھا دینے والا سخت کوش، سر فروش اور جانباز جرنیل جس کے حملہ آور ہوتے ہی رومی جن آگیا، جن آگیا کہتے ہوئے دم دبا کر بھاگنے لگتے۔ میدان کار زار میں گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے تابڑ توڑ حملہ کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اپنی بے مثال بہادری، دلاوری اور لاجواب شجاعت و جوانمردی کی بدولت ایک ہزار دشمن افراد پر بھاری جنگجو سپاہی جس کا نام سن کر دشمن تھر تھر کانپنے لگتا۔ جو اپنی بے پناہ مجاہدانہ خوبیوں کی بنا پر تاریخ اسلام کے اوراق میں قیامت تک جگمگاتا رہے گا۔ جو ضرار بن ازور اسدی کے نام سے مشہور و معروف ہے جسے اسلامی لشکر کا قابل رشک جرنیل ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ شاعر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ یہ جب بنو اسد قبیلے کے وفد کی قیادت کرتا ہوا خیر الوریٰ، شمس الضحیٰ، بدر الدجیٰ، نور الہدیٰ پیارے محمد ﷺ کی خدمت اقدس میں اسلام قبول کرنے کے لیے حاضر ہوا تو اس نے پہلا کارنامہ یہ سر انجام دیا کہ ایک ہزار اونٹ ان کے چرواہوں سمیت مسلمانوں کے بیت المال کے لیے رسول اقدس کی خدمت میں پیش کیے اور دل آویز انداز میں اشعار کہے جن کا ترجمہ یہ ہے:

میں نے شراب نوشی چھوڑ دی اور شراب کے برتن بھی توڑ دیے، کھیل کود سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی کیونکہ ان بری عادات سے جسم میں ناتوانی و کمزوری لاحق ہوتی ہے۔

ہائے افسوس میری عمر کا ایک اہم اور قیمتی حصہ مسلمانوں کے خلاف جنگ و جدل میں گزر گیا۔

میرے پروردگار اسلام قبول کر کے میں نے اپنا اور اپنا تمام مال تیری راہ میں بیچ دیا ہے، الٰہی تو میری اس تجارت کو رائیگاں نہ جانے دینا۔

سرور عالم ﷺ نے یہ اشعار سن کر مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا، اے ضرار! واقعی تیری تجارت رائیگاں نہیں گئی۔

بنو اسد قبیلے کے مالدار سردار ضرار بن ازور اسدی کے دل نے شاہ امم سلطان مدینہ ﷺ کی صداقت اور دیانت و امانت کا اعتراف کرتے ہوئے رسالت مآب پر ایمان لانے کا پختہ ارادہ کر لیا تو اپنے قبیلے کے چند افراد کو ہمنوا بنا کر رسول اقدس ﷺ کی زیارت کرنے اور اعتراف حق کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے مدینہ منورہ جانے کا تہیہ کیا اور جانے سے پہلے اپنا سارا قیمتی اثاثہ جو اعلیٰ نسل کے اونٹوں کی صورت میں موجود تھا، اللہ کی راہ میں وقف کر دیا، اس ادائے قلندرانہ کا حال سن کر سرور عالم، خلق مجسم ﷺ کو بہت خوشی ہوئی کہ ایک قوم کا سردار اور دشمن قبیلے کا خوفناک لڑاکا بہادر صدق دل سے متاع عقل و دانش سے کام لیتا ہوا، ملت اسلامیہ کا فرد بن کر ہمارا دامن گیر ہونے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ بھائی کی وارفتگی سے متاثر ہو کر اس کی بہادر بہن خولہ بنت ازور نے بھی اسلام قبول کرنے کا اعزاز حاصل کیا، یہ وہ عظیم خاتون ہے جس نے نقاب اوڑھ کر رومیوں کے خلاف جنگ لڑتے ہوئے مد مقابل کے بیشتر افراد کو اس خوفناک انداز میں تہ تیغ کیا کہ اس کی کاٹ دار تلوار، ماہرانہ شمشیر زنی اور مجاہدانہ برق رفتاری کو دیکھ کر دشمن کا پتہ پانی ہونے لگا۔ مجاہدین یہ منظر دیکھ کر خود انگشت بدنداں رہ گئے کہ ہماری جانب سے لڑنے والا یہ تیز طراز مجاہد کون ہو سکتا ہے؟ بعض نے سوچا یہ کہیں خالد بن ولید نہ ہو جو آج بھیس بدل کر میدان میں اترا ہوا ہے، لیکن جب یہ دیکھا کہ حضرت خالد بن ولید ایک عام مجاہد کے روپ میں موجود ہیں تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ خود حضرت خالد بن ولید ورطہ حیرت میں مبتلا تھے، نقاب پوش مجاہد کے پاس جا کر پوچھا تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ تو آواز آئی، اے امیر لشکر! حیران نہ ہوں میں ضرار کی بہن خولہ بنت ازور ہوں۔ یہ آواز سن کر تمام مجاہدین حیرت و استعجاب کی تصویر بن گئے، آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک اس بات کی غمازی کر رہی تھی اور زبان حال سے یہ صدا آرہی تھی کہ جب تک ملت اسلامیہ میں یہ جذبہ جہاد موجود رہے گا کہ وقت آنے پر مرد تو کجا خواتین بھی دشمن کے دانت کھٹے کرنے میں پوری صلاحیت اور مہارت رکھتی ہوں گی، اس وقت تک دنیا کی کوئی بھی طاقت ملت اسلامیہ کو نیچا نہیں دکھا سکتی اور نہ ہی فتح و کامرانی میں کوئی رکاوٹ حائل ہو سکتی ہے۔

(جرنیل صحابہ از محمود احمد غضنفر)

سیدنا عبد اللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کا سوال سن کر رسول اکرم ﷺ کا مسکرانا

سلیم الفطرت، شریف النفس، ظریف الطبع، ذہین وفطین، فہیم و عقیل، خوش اخلاق و خوش اطوار، شیریں کلام وسحر البیان گلیم فقیری میں سرمایہ سلطانی رکھنے والا بارعب وباوقار صحابی جس نے قیصر وکسریٰ کے دربار میں جرأت وشجاعت کا مظاہرہ جان ہتھیلی پر رکھ کر کیا، جس سے دربار کے

تمام حاشیہ نشین انگشت بدنداں رہ گئے۔ جس کی ظرافت وخوش طبعی سے مجلس کشت زعفران بن جاتی، شاہ امم سلطان مدینہ ﷺ اس کی ظریفانہ گفتگو سے مسرت وشادمانی کا خوشگوار تاثر لیتے۔
ایک روز سرور عالم، خلق مجسم، نیر تاباں، روشن درخشاں، رسول معظم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے قیامت کی ہولناکیاں بیان کیں۔ قیامت کے دن پیش آنے والے حالات کا سن کر سب کے دل کانپنے لگے، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پورا مجمع زار وقطار رو رہا تھا، قیامت کا بیان ختم ہوا، رسول اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اگر کسی کے دل میں کوئی سوال ہو تو پوچھ لے۔"
حضرت عبد اللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے افسردہ ماحول میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کے لیے ایک انوکھا سوال کیا، عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! میرا باپ کون ہے؟
آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تیرا باپ حذافہ ہے، اس سوال وجواب سے غم میں مبتلا ماں کو جب اس سوال کا پتہ چلا تو بہت زیادہ کبیدہ خاطر ہوئی اور اس نے اپنے بیٹے عبد اللہ سے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، یہ کوئی سوال تھا جو تو نے رسول اکرم ﷺ سے کیا۔ کیا تجھے معلوم نہ تھا کہ تیرا باپ کون ہے؟ یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات تھی۔
حضرت عبد اللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے اپنی اماں جان سے مودبانہ انداز میں عرض کیا، اماں جان ناراض نہ ہوں، میں نے جب دیکھا کہ میرے ساتھی زبان رسالت مآب سے قیامت کے واقعات سن کر غمزدہ ہیں تو میں نے یہ انوکھا سوال صرف اس لیے کیا کہ مجمع کشت زعفران بن جائے۔ میرا یہ سوال سن کر خود رسول اقدس ﷺ بھی مسکرانے لگے، آپ کی مسکراہٹ پر میں قربان، آپ کی طبیعت میں خوشگوار تاثرات پیدا کر کے مجھے دلی راحت نصیب ہوئی۔ اماں جان، آپ یقین کیجیے میرا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ تھا، میں نے تو صرف یہ چاہا کہ اہل مجلس کا غم ہلکا ہو جائے۔
شاہ امم سلطان مدینہ ﷺ کے نزدیک حضرت عبد اللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ اپنی ظریفانہ طبیعت کے باوجود قابل اعتماد تھے، آپ نے انہیں ایک ایسے لشکر کا امیر بنا کر محاذ پر روانہ کیا جس میں جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے۔
شاہ امم سلطان مدینہ ﷺ نے ان کی بچکانہ باتیں سن کر مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا:
"آج تم اپنی قیام گاہ میں آرام کرو، تم ہمارے مہمان ہو، کل دیکھا جائے گا۔" دوسرے دن تیار ہو کر آپ کے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا خیال ہے؟ کیا ارادے ہیں؟ کیا بخوشی شاہ ایران کے دربار میں پیش ہونے کے لیے تیار ہیں؟ ان کی بات سن کر آپ نے جلالی انداز میں ارشاد فرمایا: "کون کسریٰ کون شاہ ایران! کان کھول کر سن لو وہ تباہ وبرباد ہو چکا ہے۔ اس کے بیٹے نے اسے قتل کر دیا ہے۔" دونوں جرنیل یہ ناگہانی خبر سن کر ورطہ حیرت میں پڑ گئے اور خوف وہراس کے ملے جلے جذبات سے شاہ امم سلطان مدینہ ﷺ کے چہرۂ انور کی طرف ٹکٹکی لگا کر حیرت کی تصویر بنے ہوئے دیکھنے لگے۔
دونوں جرنیل پوچھنے لگے جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، کیا یہ ہولناک خبر ہم اپنے حکمران باذان تک پہنچا دیں؟
آپ نے ارشاد فرمایا: ہاں، یہ سچ ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اسے بتا دینا کہ دین اسلام کا دائرہ کسریٰ کی سلطنت تک پھیل جائے گا، اگر تم اسلام قبول کر لو تو ہم وہ سبھی کچھ تمہارے حوالے کر دیں گے جو اب تمہارے پاس ہے، گویا اس صورت میں تمہاری موجودہ حکمرانی اپنی قوم پر بدستور قائم رہے گی۔
یہ دونوں نمائندے رسول اللہ ﷺ سے رخصت ہو کر باذان کے پاس پہنچے اور اسے یہ خبر سنائی، اس نے سن کر کہا، حضرت محمد ﷺ کی یہ بات سچ ہوئی تو پھر ان کے نبی ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن اگر یہ بات صحیح ثابت نہ ہوئی، تو پھر ہم ان کے متعلق جو رائے قائم کریں گے وہ تم دیکھ لو گے۔
ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ باذان کو کسریٰ کے بیٹے شیرویہ کا یہ خط موصول ہوا جس میں یہ تحریر تھا: "میں نے کسریٰ کو مار ڈالا ہے اور مارا بھی اس لیے تھا کہ اپنی قوم کا انتقام لے سکوں۔ اس نے اپنے عہد اقتدار میں میری قوم کے شرفاء کا قتل عام شروع کیا تھا، یہی نہیں اس نے ان کی عورتوں کی بے حرمتی بھی کی اور ان کے مال ودولت کو غصب بھی کیا، میرا یہ خط جب تمہارے پاس پہنچے تو تم میری حلقہ بگوشی کرنا۔
باذان نے شیرویہ کا خط جب پڑھا تو خط کو ایک طرف پھینک دیا اور حلقہ بگوش اسلام ہو گیا اور اس کے ساتھ بلاد یمن کے تمام فارسی النسل باشندے بھی مسلمان ہو گئے۔ (جرنیل صحابہ از محمود احمد غضنفر)

رسول اکرم ﷺ نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا، عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی نیت خالص ہے!

جنگ موتہ میں قیادت کے فرائض سر انجام دینے والا، جنگ بدر میں شرکت کا اعزاز حاصل کرنے والا، غزوہ سویق کے دوران دربار رسالت کی جانب سے مسند خلافت پر جلوہ افروز ہونے والا، تیس مجاہدین کی قیادت کرتے ہوئے خیبر کے مشہور ومعروف یہودی اسیر بن رزام کو تہہ تیغ کرنے والا، شاہ امم سلطان مدینہ ﷺ کی جانب سے خیبر کی زمین اور اس کے مالی وسائل کا تخمینہ لگانے کی ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھانے والا، رزم وبزم میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھلانے والا سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا ماموں اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کا بھائی میدان جنگ کو جاتے ہوئے لشکر اسلام میں سب سے آگے اور واپسی پر لشکر کے پیچھے پیچھے آنے والا جلیل القدر صحابی حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ، جس کے متعلق حضرت انس فرماتے ہیں کہ جب یہ کسی بھی ساتھی کو ملتے تو اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتے، آیئے میرے بھائی کچھ دیر کے لیے ہم اپنے ایمان کی تجدید کر لیں۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ انہوں نے حسب عادت ایک ساتھی کو یہی الفاظ کہے تو وہ غصے میں آ گیا اور اس نے دربار رسالت میں شکایت لگاتے ہوئے کہا: یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ یہ ابن رواحہ بڑا عجیب آدمی ہے یہ ہمیں کچھ دیر کے لیے ایمان لانے کو کہتا ہے حالانکہ ہم مستقل آپ پر ایمان لا چکے ہیں۔ بھلا یہ کیا ہوا کہ کچھ دیر کے لیے ایمان کی تجدید کر لیں؟

آپ نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"تم محسوس نہ کیا کرو، عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی نیت خالص ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس کے دامن کو اپنی رحمت سے بھر دے، دراصل وہ بار بار ایسی محفل سجانا چاہتا ہے جس پر فرشتے بھی فخر کریں۔"

خیر الوریٰ، بدر الدجیٰ، شمس الضحیٰ، نور الہدیٰ، پیارے مصطفیٰ محمد ﷺ کی محبت، الفت، عقیدت اور اطاعت کا جذبہ ان کے نہاں خانہ دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ مسجد نبوی کی طرف تشریف لا رہے تھے۔ سرور عالم خلق مجسم، رسول معظم ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ یہ ابھی مسجد کے دروازے کے باہر ہی تھے کہ آپ نے دوران خطاب ارشاد فرمایا: بیٹھ جاؤ۔

یہ حکم سنتے ہی ان کے قدم اسی وقت رک گئے اور فوراً وہیں جو توں میں بیٹھ گئے۔ رحمت عالم، نیر تاباں، روشن و رخشاں، خلق مجسم ﷺ کو اپنے جاں نثار صحابی کی یہ ادا بہت پسند آئی اور آپ نے خوش ہو کر ان کے حق میں یہ دعا کی:

زادك الله حرصا على طاعة الله وطاعة رسوله

"اللہ تعالیٰ اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کے جذبے کو تیرے دل میں پروان چڑھائے۔"

عقیدت، محبت اور اطاعت ہو تو ایسی کہ جس پر ملائکہ بھی رشک کریں۔

حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بہترین کاتب ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ شاعر بھی تھے، ان کی شاعری کا چرچا دور دور تک پھیلا ہوا تھا، حضرت عروہ بن زبیر ارشاد فرماتے ہیں کہ جب قرآن مجید میں یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿ وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ﴾

"شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ ہی کرتے ہیں۔"

یہ قرآنی آیت سن کر حضرت عبد اللہ بن رواحہ، حضرت حسان بن ثابت اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہم زار و قطار رونے لگے۔ آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں، کہنے لگے، ہائے افسوس، ہم مارے گئے، ہمارا شمار تو ان لوگوں میں ہوتا ہے، جن کی مذمت میں قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی، ہمارا اب کیا بنے گا، کاش کہ شعر و شاعری سے ہمارا دور کا بھی واسطہ نہ ہوتا، ان کی گریہ زاری اور آہ وفغاں پر ترس کھاتے ہوئے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

﴿ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ﴾

"مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔"

یعنی مؤمن اور نیک شاعر اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ حکم سن کر تینوں جلیل القدر شاعر صحابہ کرام کو دلی اطمینان نصیب ہوا، ان کا غم خوشی میں تبدیل ہو گیا، غمگین آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی اور دل حزیں مسرت و شادمانی کا گہوارہ بن گیا، پھر انہوں نے اسلام کے دفاع کی خاطر دلکش انداز اور ولولہ انگیز اسلوب میں خوب شاعری کی۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت اینٹیں اور گارا ڈھوتے ہوئے شاہ امم سلطان مدینہ ﷺ کی زبان پر حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کا یہ مشہور و معروف شعر جاری تھا اور آپ بار بار اسے دہرا رہے تھے:

اللّٰهُمَّ لا عيش إلا عيش الأخرة
فاغفر الأنصار والمهاجرة

"الٰہی! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔
الٰہی! انصار اور مہاجرین کو بخش دے۔"

تعمیر مسجد میں مصروف تمام صحابہ کرام بھی دلفریب انداز میں یہی شعر گنگنا رہے تھے، جس سے ماحول میں عجیب سماں پیدا ہو چکا تھا، ہر کوئی یہ شعر پڑھتے ہوئے تعمیراتی کام کو راضی خوشی سر انجام دے رہا تھا، شاہ امم سلطان مدینہ ﷺ کا اونچی آواز میں یہ شعر پڑھنا، جہاں اچھی شاعری کی تعریف و توصیف کی غمازی کرتا ہے۔

حضرت قیس بن حازم کی روایت ہے کہ رسول اقدس ﷺ نے ایک روز ارشاد فرمایا کہ ابن رواحہ اپنے تازہ کلام سے ساتھیوں کے دل گرمائیں اور ان میں تحریک پیدا کریں، عرض کی، یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، آج کل تو میں نے شعر کہنے چھوڑے ہوئے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پاس ہی کھڑے تھے، انہوں نے جلالی انداز میں ارشاد فرمایا:

سنو! اللہ کے رسول کی اطاعت کرو۔

حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ یہ بات سنتے ہی ارتجالاً یہ شعر کہنے لگے:

تَاللهِ لَولا اللهُ ما اِهتَدَينا
وَلا تَصَدَّقنا وَلا صَلَّينا
فَأَنْزِلَنْ سَكِينَةً عَلَيْنَا
وثَبِّتِ الأَقْدَامَ إِنْ لَاقَيْنَا
الكافِرونَ قَد بَغَوا عَلَينا
إِن أَرادوا فِتنَةً أَبَينا

"اللہ کی قسم! اگر اللہ کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہ پاتے۔ نہ صدقہ دیتے اور نہ ہی نماز پڑھتے، الٰہی ہم پر سکینت نازل فرما۔ الٰہی جب ہم دشمن سے نبرد آزما ہوں تو ہمیں ثابت قدم رکھنا۔"

بلاشبہ دشمن نے ہم پر ظلم کیا ہے، جب یہ کسی فتنے کا ارادہ کریں گے تو ہم انکار کر دیں گے۔

ایک روز ان کی رفیقہ حیات نے تازہ کلام سننے کی فرمائش کی تو آپ نے برجستہ یہ شعر پڑھا:

شَهِدتُ بِأَنَّ وَعدَ اللهِ حَقٌّ
وَأَنَّ النارَ مَثوى الكافِرينا

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ برحق ہے اور جہنم کافروں کا ٹھکانہ ہے۔"

بیوی نے جھومتے ہوئے کہا، واہ واہ کتنا اچھا شعر کہا، کچھ اور سنائیے، بڑا ہی ایمان افروز شعر تھا، آپ کی شاعری کے کیا کہنے!

وَأَنَّ العَرشَ فَوقَ الماءِ طافٍ
وَفَوقَ العَرشِ رَبُّ العالَمينا
وَتَحمِلُهُ مَلائِكَةٌ كِرامٌ
مَلائِكَةُ الإِلَهِ مُقَرَّبينا

"بلاشبہ عرش پانی پر تیر رہاہے اور عرش کے اوپر پروردگار عالم جلوہ افروز ہیں، اس عرش کو معزز فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں اور یہ معبود حقیقی کے فرشتے اس کے ہاں مقرب اور محترم ہیں۔"

(جرنیل صحابہ تالیف محمود احمد غضنفر)

بیوی کی فرمائش اور اپنی شعر گوئی کا تذکرہ سیدنا عبد اللہ بن رواحہ ؓ نے رحمت عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں پیش کیا، تو آپ ﷺ مسکرا اٹھے۔

سر زمین شام کے سرحدی مقام موتہ کی طرف روانگی کے لیے جو اسلامی لشکر ترتیب دیا گیا، اس کے لیے شاہ امم سلطان مدینہ ﷺ نے تین سپہ سالار نامزد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، اس لشکر کے پہلے امیر زید بن حارثہ ہوں گے، اگر یہ راہ حق میں شہید کر دیے جائیں تو پھر لشکر کی قیادت جعفر بن ابی طالب کے سپرد کر دی جائے اور جب وہ شہید ہو جائیں تو لشکر کی قیادت کے فرائض عبد اللہ بن رواحہ سر انجام دیں گے، دربار رسالت سے حکم پا کر جب مجاہدین کا یہ قافلہ مدینہ منورہ سے روانہ ہونے لگا اور مدینہ منورہ میں موجود مسلمانوں نے انہیں دعاؤں اور نیک تمناؤں سے رخصت کیا تو حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے برجستہ یہ شعر کہے:

لَكِنَّنِي أَسْأَلُ الرَّحْمَنَ مَغْفِرَةً
وَضَرْبَةً ذَاتَ فَرْغٍ تَقْذِفُ الزَّبَدا
أَوْ طَعْنَةً بِيَدَيْ حَرّانَ مُجْهِزَةً
بِحَرْبَةٍ تُنْفِذُ الْأَحْشَاءَ وَالْكَبِدَا
حَتّى يُقَالَ إِذَا مَرّوا عَلَى جَدَثِي
أَرْشَدَهُ اللهُ مِنْ غَازٍ وَقَدْ رَشَدَا

"میں اللہ رحمٰن سے بخشش کا سوالی ہوں اور ایسی کاٹ دار تلوار کا سوالی ہوں جو جھاگ اڑاتی ہو یا میرے ہاتھ میں ایسا نیزا ہو جو حران مقام کا تیار شدہ ہو یا ایسا برچھا ہو جو آنتوں اور جگر کے آر پار ہو جائے۔"

میری دلی تمنا ہے کہ جب لوگ میری مرقد کے پاس سے گزریں تو یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس مرد میدان کی خود راہنمائی کی ہے۔

سرزمین شام کے سرحدی مقام موتہ کے میدان میں مجاہدین نے پڑاؤ کیا دیکھا کہ شاہ روم ہرقل ایک لاکھ فوج کی قیادت کرتا ہوا، میدان میں اترا ہوا ہے تو بعض مجاہدین نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ہمیں پہلے دربار رسالت میں یہ پیغام پہنچا دینا چاہیے کہ مقابلہ بہت سخت ہے، رومی فوج ایک لاکھ کی تعداد میں اسلحے سے لیس ہو کر میدان میں اتری ہوئی ہے جبکہ مجاہدین صرف تین ہزار ہیں، جنگی لحاظ سے مسلمان خطرے میں ہیں۔ دربار رسالت سے جو حکم آئے، اس کی تعمیل کی جائے۔ حضرت عبد اللہ بن رواحہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے پورے جوش وجذبہ سے فرمانے لگے:

میرے ساتھیو! کیوں گھبرا رہے ہو؟ جنت تمہاری منتظر ہے۔ آج شہادت کا بلند رتبہ حاصل کرنے کا سنہری موقع ہے۔

میدان جہاد میں اترتے ہوئے ہمیں قلت و کثرت کو نہیں دیکھنا چاہیے ہم تو دین کی سربلندی کے لیے سربکف میدان میں نکلے ہوئے ہیں۔ اسی دین کی وجہ سے ہمیں عزت وسرفرازی نصیب ہوئی ہے، انجام سے بے خبر ہو کر میدان میں کود جاؤ، نتیجہ جو بھی ہو گا، تمہارے حق میں بہتر ہو گا، مارے گئے تو شہید بچ نکلے تو غازی۔

ان کے پرجوش خطاب نے مجاہدین کے دلوں کو گرمایا اور وہ سربکف انجام کی پرواہ کیے بغیر میدان میں اتر گئے گھمسان کا رن پڑا۔ امیر لشکر حضرت زید بن حارثہ ؓ داد شجاعت دیتے ہوئے جام شہادت نوش کر گئے، اسلامی لشکر کا جھنڈا جعفر بن ابی طالب نے تھام لیا، وہ بھی دیوانہ وار لڑتے ہوئے ملک عدم کو سدھار گئے۔ آگے بڑھ کر حضرت عبد اللہ بن رواحہ ؓ نے لشکر کی قیادت سنبھالتے ہوئے یہ شعر پڑھے:

أَقسَمتُ يا نَفسُ لَتَنزِلِنَّه
لتنزلن أو لتكرهنه
إِن أَجلَبَ الناسُ وَشَدّوا الرَنَّة
ما لي أَراكِ تَكرَهينَ الجَنَّة
قَد طالَمَا قَد كُنتِ مُطمَئِنَّة
هَل أَنتِ إِلّا نُطفَةٌ في شَنَّه

"اے نفس مجھے قسم ہے تجھے بخوشی یا بامر مجبوری میدان میں ضرور اترنا ہو گا۔

اگرچہ لوگ جمع ہو گئے اور چیخ وپکار کرنے لگے یہ کیا ہوا میں تجھے جنت میں جانے سے گریزاں دیکھ رہا ہوں۔ بلاشبہ تو نے لمبی مدت اطمینان سے زندگی بسر کی۔ کیا تو ایک روز رحم مادر میں گندے پانی کا ایک حقیر قطرہ نہ تھا؟ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو تلقین کرتے ہوئے یہ شعر پڑھ رہے تھے:

يا نفس إن لا تقتلي تموتي
هذا حمام الموت قد لقيت
وما تمنيت فقد أعطيت
ان تفعلي فعلهما هد يت
وإن تأخرت قد شقيت

"اے نفس! اگر تجھے قتل نہ کیا گیا تو تو پھر بھی مر جائے گا، اس موت کے پرندے سے یقیناً تو ملے گا۔ جو تو نے تمنا کی وہ تجھے عطا کر دی گئی۔ اگر تو نے اپنے پیش رو دونوں شہیدوں جیسا کام کیا تو راہ ہدایت پہ ہو گا اور اگر تو کوتاہی کا ارتکاب کرتے ہوئے میدان میں اترنے سے پیچھے ہٹا تو بد بختی تیرا مقدر بن جائے گی۔

یہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھے اور دشمن کا دیوانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کر گئے، لشکر اسلام کا جھنڈا آگے بڑھ حضرت ثابت بن اقرم نے پکڑ کر حضرت خالد بن ولید کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا، اب آپ ہی اس کشتی کو بھنور سے نکالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، آپ آگے بڑھیں اور اس ڈولتی ہوئی ناؤ کو کنارے لگانے میں اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں، میری نظر میں اب آپ سے بہتر اس لشکر کو سنبھالنے کے لیے ہم میں اور کوئی نہیں میں اور میرے تمام ساتھی متفقہ طور پر آپ کو اپنا امیر تسلیم کرتے ہیں۔ (جرنیل صحابہ تالیف محمود احمد غضنفر)

مسلم فاتحین کی عظمت

تاریخ گواہ ہے کہ 'مسلمان'، 'اہل ایمان' مالک حقیقی کے نام لیوا، رحمۃ اللعالمین کے جانثار، انسانیت کے علمبردار، امن عالم کے نمائندہ، مسلمان جہاں بھی گئے۔ اپنی اعلیٰ ظرفی، انسانیت کی قابل قدر خدمات کے ساتھ ساتھ۔ وہ عظمت، شان و شوکت اور جاہ وجلال کے باوقار اور پرہیبت آثار بھی بناتے رہے۔۔ ان کے برعکس دیگر مذاہب کے علمبردار جہاں بھی قابض ہوئے، بغض وعناد سے بھرے ہوئے، ظلم و ستم اور غیض وغضب سے لتھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے خون آشام جبڑوں نے انسانیت کا وہ خون کیا کہ تاریخ عالم ان کی درندگی اور سنگدلی سے خونچکاں ہے۔ ان کا سارا زور اسلام کو مٹانے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی بنائی یادگاروں اور عمارتوں کو داغدار کرنے پر رہا۔ سپین و اندلس اور ہندوستان کی مساجد و قلعے اور محلات کے ساتھ ساتھ بیت المقدس اور فلسطین کی حالیہ تاریخ بھی اس بات کی گواہ ہے۔۔۔ ارض مقدسہ فلسطین۔۔۔ جہاں اب یہود کا قبضہ ہے، جن کی سنگدلی اور خوفناکی کی وجہ سے یہ ارض مقدسہ بھی تن داغدار اور گولہ وبارود کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے اور فلسطینی مسلمانوں ہی کیلئے نہیں وہاں کے تمام باشندوں کیلئے امن کا ایک بھولا بسرا خوفناک خواب بن چکی ہے۔

صخراء: یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے مسجد اقصیٰ تعمیر کی تھی، جس کا ذکر احادیث میں بیت اللہ اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟ کے ضمن میں آتا ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی اور مسجد اقصیٰ اس کے چالیس سال بعد حضرت اسحٰق علیہ السلام نے کی۔ (صحیح بخاری:3366؛ صحیح مسلم:520)

پھر سلیمان علیہ السلام نے یہاں عظیم الشان عبادت گاہ (مسجد) بنائی۔ جسے یہود ہیکل سلیمانی کہتے ہیں اور مسلمان مسجد۔ اس ہیکل یا مسجد کو شاہ بابل بخت نصر نے 587ق م میں مکمل طور پر برباد کر دیا، یہود کی بابل میں اسیری سے لوٹنے کے بعد دوبارہ ہیکل تعمیر کیا گیا جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ستر سال بعد رومن بادشاہ ٹائٹس نے ملیامیٹ کر دیا تھا اور عہدِ نبوی کے رومن بادشاہ ہیڈریان نے اس کے سارے کھنڈرات تک اکھاڑ ڈالے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ ہیکل سلیمانی مکمل تباہ کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس کی مغربی دیوار بچ رہی تھی۔ اس کے دروازے سے آنحضور ﷺ معراج کی رات داخل ہوئے تھے اور جہاں آپ نے براق باندھا تھا اسی نسبت سے اسے دیوار براق کہا جاتا ہے جبکہ یہود اسے دیوار گریہ کا نام دیتے ہیں۔

اوپر آپ پڑھ آئے ہیں کہ بعض کتابوں میں دور نبوی میں یہاں کسی عمارت کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن روایات و آثار اس کی تائید نہیں کرتے۔ البتہ سیاحوں کی کی رہنمائی کیلئے جو کتب میسر ہیں ان میں سے ایک کتاب (Israel & Palestinian Territories) کے مصنف نے ص86 پر لکھا ہے کہ "بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بازنطینی دور میں قبۃ الصخراء کے ایریے میں کوئی بہت زیادہ تعمیر نہیں کی گئی تھی لیکن (مدابا) اردن میں ملنے والے نقشے سے ظاہر ہوتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں اس پلیٹ فارم پر کے بیرونی اطراف میں میں کوئی تعمیر پائی جاتی تھی۔ شاید اس کے جنوب مشرقی حصہ میں ایک کنیسہ کا ذکر ملتا ہے جس کا ایک زائر نے بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس کے سوا کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا (بیت المقدس میں تین دن، از ڈاکٹر صہیب حسن لندن) اگر یہ صحیح ہے تو یہ اشکال حل ہو جاتا ہے کہ نبی ﷺ نے سفر معراج میں کسی عبادتگاہ میں نماز پڑھائی تھی جسے قرآن کریم نے مسجد اقصیٰ کا نام دیا ہے اور جس کا دروازہ اس رات بند نہیں ہو رہا تھا۔ چونکہ تاریخ بعض جگہ ایسی خاموش ہے کہ اس کی خاموشی سناٹے میں بدل چکی ہے۔ ممکن ہے یہاں کوئی تاریخی آثار ہوں جو عیسائیوں نے یہود دشمنی کی بھینٹ چڑھا دیے ہوں۔ کیونکہ اس صخرہ کی یہود کے نزدیک بھی بڑی تعظیم تھی۔ یہ پوری دنیا سے افضل ترین جگہ سمجھی جاتی تھی، ان کے نزدیک یہ صخرہ مروہ پہاڑی کی طرح تاریخی اور مقدس ہے۔ جہاں ان کے خیال میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔ کعب احبار جو یہودی تاریخ کے بڑے ماہر تھے اسی لیے انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس جگہ نماز پڑھنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، جسے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی عقابی نگاہوں نے بھانپ لیا اور وہاں نماز ادا نہیں کی کہ پتھر کی تعظیم مقصود نہیں تھی۔ اگر آپ اس پتھر کو ہاتھ لگانا چاہیں۔

موجودہ گنبد کی یہ شکل عبدالملک مروان کے دور میں بنائی گئی۔ پھر عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے بھی اس پر کافی کام کیا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کی تزئین و آرائش ہوتی رہی۔ اب اس کے اوپر سونے کا جو کلس (1959) میں چڑھایا گیا۔ اس کا وزن دو سو کلو بتایا جاتا ہے۔ مسجد اقصیٰ کے اس اونچے پلیٹ فارم میں بنی مسجد صخرہ کے درمیان میں اس چٹان اور اس کے نیچے غار کو دیوار بنا کر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اب اگر آپ اس پتھر کو ہاتھ لگانا چاہتے ہیں تو وہاں موجود ایک چھوٹے سے

کیبن میں جائیے اور سوراخ میں ہاتھ ڈالیے۔ آپ کا ہاتھ اس پتھر کو چھولے گا۔ اس پتھر کے نیچے ایک غار ہے جس میں کبھی تابوت سکینہ رکھا ہوا تھا جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور حضرت داؤد علیہ السلام کے تبرکات اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب انگوٹھی رکھی ہوئی تھی (تابوت سکینہ کا ذکر سورہ بقرہ کی آیت 247 میں آیا ہے) اوپر ایک جگہ کرسی سلیمان کہلاتی ہے، غالباً سیدنا سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب ہے یا سلطان سلیمان القانونی کی طرف، تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

امام مسجد قبۃ الصخراء سے ملاقات

قبۃ الصخراء مسجد میں دن کی نمازیں بھی باجماعت ادا کی جاتی ہیں اور جمعہ میں مسجد قبۃ الصخراء میں عورتیں مرکزی مسجد کے امام کے پیچھے نماز ادا کرتی ہیں کیونکہ مسجد قبلی میں صرف مرد حضرات نماز جمعہ پڑھتے ہیں۔ مسجد قبۃ الصخراء کے گول ہال کو اچھی طرح چل پھر کر دیکھا۔ اس کی چھت پر قرآنی آیات کی نقش نگاری کمال کی چیز ہے، آنکھیں نہیں تھکتیں، گردن بہر حال اکڑ جاتی ہے۔ کسی غرور کی وجہ سے نہیں تھکاوٹ کی وجہ سے۔ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ آپ قالین پر لیٹ جائیں اور جی بھر کر آنکھوں کو قرآنی آیات کی نقش نگاری سے ٹھنڈا کریں۔ ہم مسجد صخر کا چل پھر کر جائزہ لے رہے تھے۔ اتنی دیر میں ہماری نظر وہاں امام صاحب پر پڑی، تعارف ہوا ان کا نام ہے۔ الشیخ علی العباسی۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی کا اظہار کیا کہ اچھا ہے آپ لوگ یہاں آنے لگ گئے، انہوں نے مزید بتایا کہ میرا بیٹا محمد بن علی العباسی نماز تراویح یہیں پڑھاتا ہے۔ مسجد صخرہ کے قبلہ رخ دروازے سے باہر نکلیں تو چند سو قدم کے فاصلے پر یہ اونچا دالان ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں کئی سیڑھیوں پر مشتمل ایک پتھر کا منبر ایستادہ ہے۔ مسجد کی عمارت تک کھلے صحن میں زیتون اور شاہ بلوط کے کئی درخت نمازیوں کیلئے سایہ دراز کیے رکھتے ہیں۔

صلیبیوں کی خونچکانی کی مزید یادگاریں

1099ء میں جب عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو انہوں نے پھر سے یروشلم میں ظلم و ستم کی داستانیں دہرائیں۔ انہوں نے قبۃ الصخراء کو چرچ بنا دیا اور اس کے اوپر صلیب نصب کر دی۔ قبلی مسجد کو رہائش گاہ بنا دیا اور تہہ خانے میں مصلی مروانی کو گھوڑوں کا اصطبل بنا دیا۔ مسجد اقصیٰ کے صحن میں چار جگہ صلیبیں نصب کر دیں اور ان صلیبوں پر کم و بیش اسی (80) ہزار مسلمانوں کی گردنیں کاٹیں اور عیسائی مورخین کے مطابق مسلمانوں کا اتنا خون بہایا گیا کہ یروشلم کی گلیاں خون سے بھر گئیں۔ گھوڑوں کی ٹانگیں بے گناہوں کے خون سے ڈوب گئی تھیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے (1187ء) میں جب بیت المقدس کو فتح کیا تو صحن مسجد میں یہ مناظر یاد کر کے بہت غمگین ہو گئے۔ انہیں مشورہ دیا گیا کہ ان صلیبوں کو اکھاڑ پھینکیں اور یروشلم میں عیسائیوں کے تمام چرچ مٹا دیے جائیں، لیکن سلطان نے جواب دیا کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم غیر مسلموں کی عبادتگاہوں کو مٹا دیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اہل یروشلم کو اسی جگہ معاہدہ لکھ کر دیا تھا کہ ہم عیسائیوں اور دیگر اقلیتوں کی عبادتگاہوں کو نہیں گرائیں گے۔ لہٰذا میں کسی چرچ کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یاد رہے کہ مسلم فاتحین نے ہر قسم کی عبادتگاہوں کو ہمیشہ اور ہر جگہ محفوظ رکھ کر اپنا اعزاز و انفرادیت کو باقی رکھا ہے۔ حالانکہ اس وقت ابھی زخم تازہ تھے۔ (یعنی صرف 88 سال پرانی بات تھی) جبکہ صلیبیوں اور صیہونیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے انسانیت سوز مظالم کیے تھے اور کسی عہد کی پاسداری نہیں کی۔

چنانچہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے قبۃ الصخراء کے اوپر نصب کردہ صلیب اتار دی گئی اور صحن مسجد میں گاڑے گئے ان چار صلیبی نشانوں کو بھی آدھا آدھا توڑ دیا تاکہ یہ نشانات شرک ختم ہو جائیں، اور مسجد اقصیٰ کی اصل صورت باقی رہے۔ تین ٹوٹی ہوئی صلیبوں کے نشان بیت المقدس کی مغربی دیوار کے ساتھ اور قبلی مسجد کی دائیں جانب ہیں اور ایک ٹوٹا ہوا کراس صحن قبۃ الصخراء میں بطور علامت موجود ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر عیسائی قابضین کے ظلم و سنگدلی اور مسلمان فاتحین کی رحمدلی اور اصولوں کی پاسداری کا یقین آجاتا ہے۔ میرے قافلے کے سبھی لوگ ظلم و ستم کے پرانے اور نئے دور اور انداز کو ذہن میں تازہ کر کے اور صحن مسجد قبۃ میں ٹوٹے ہوئے صلیبی نشانوں کو اپنے سامنے پاکر بہت دلگرفتہ ہوئے، میں نے انہیں وہاں سے آگے چلنے کا کہا۔

اسرائیل کا غاصبانہ قبضہ

یہ تو آپ نے گنبد صخراء کی تعمیری تاریخ ملاحظہ کی لیکن اس پر مسلمانوں کا کنٹرول کبھی بھی آسانی سے نہیں رہا۔ مسلمان بادشاہوں اور مقامی فلسطینی مسلمانوں کو ہر دور میں بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کو 16 جنگیں لڑنا پڑی تھی۔ ان کے بعد بھی کافی مشکلات پیش آتی رہیں لیکن مسجد اقصیٰ پر مسلمانوں ہی کا اختیار رہا۔ بیسویں صدی کے وسط تک مسجد اقصیٰ میں غیر مسلموں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ اسے الحرم الشریف کا لقب بھی دیا گیا تھا۔ جہاں غیر مسلم کو داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ 1967 کے بعد غیر مسلموں کو محدود داخلے کی اجازت دی گئی۔ لیکن وہ یہاں عبادت نہیں کر سکتے اور نہ ہی اپنا مذہبی لٹریچر ساتھ لا سکتے ہیں۔ 1967 میں چھ (6) دن کی جنگ کے بعد اسرائیلیوں نے یروشلم کے مشرقی حصے پر تسلط حاصل کر لیا لیکن اس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم موشے دایان نے مسجد اقصیٰ کی دیکھ بھال اردن کے شاہ حسین کے حوالے کر دی۔ شاہ حسین نے مسجد اقصیٰ کا انتظام چلانے کیلئے ایک ٹرسٹ قائم کر دیا۔ جو اس کا پورا انتظام کرتا ہے۔ اب عجیب صورتحال ہے کہ مسجد اقصیٰ کا اندرون تو اردنی وقف کے تحت ہے

لیکن بیرون اسرائیلوں کے غاصبانہ قبضے میں ہے۔ ان کی فوج مسجد کے دروازوں پر تسلط جمائے ہوتی ہے جسے چاہے اندر داخل ہونے دیں اور جسے چاہیں باہر ہی روک لیں۔ اگر کوئی غیرت میں آکر آواز بھی نکالے تو اسے گولی بھی مار دی جاتی ہے۔ ان کا جب جی چاہے وہ مسجد کے اندر اپنے ناپاک قدموں کے ساتھ درانہ گھس بھی آتے ہیں، حالانکہ معاہدہ میں یہ اجازت شامل نہیں ہے۔ طرفہ تماشایہ ہے کہ اسرائیلیوں کی ان غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکات کو کسی عدالت میں چیلنج بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ساری دنیائے کفر ملت واحدہ بنی ہوئی ہے لیکن مسلمانوں کو یہ بات سمجھ نہیں آرہی۔

صابرہ شتیلا کیمپ اور جماعت اسلامی

قبۃ الصخراء کے صحن سے نکل کر ہم مشرقی دیوار کے ساتھ ساتھ زیتون کے درختوں کے درمیان شمال کی طرف چھوٹی سی ہموار سڑک پر چلتے گئے۔ پیچھے صحن قبۃ الصخراء میں ہم صلیبیوں کے ظلم و ستم کے باعث دل گرفتہ تھے اور یہاں اسرائیلیوں کی سنگدلی کے مظاہر کی یادیں دیکھ کر طبیعت میں تکدر پیدا ہوگیا۔ جب ایک جگہ "صابرہ شتیلا کیمپ" کے الفاظ پر نظر پڑی۔ میں وہیں کھڑا ہو گیا۔ یہ نام جانے پہچانے محسوس ہوئے۔ میں ان ناموں سے اوائل عمری ہی میں آگاہ تھا۔ کیونکہ اس نام کے کیمپوں میں فلسطینی پناہ گزین مقیم تھے۔ جن کا اسرائیلی وزیر دفاع ایریل شیرون نے سفاکانہ قتل عام کیا تھا۔ پاکستان میں جماعت اسلامی وہ واحد جماعت تھی جس نے اس زمانے میں ان مظالم کے خلاف احتجاج کیا تھا کیونکہ یہ جماعت اپنے بانی مولاناسید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی پالیسی کے مطابق اس زمانے میں بیرون ممالک میں اسلامی تحاریک سے اہل پاکستان کو متعارف کروانے میں بہت سرگرم تھی۔ اسلامی جمعیت طلباء کے گرمیلے اور پرجوش خون کے ذریعے دنیا کو بیرونی اسلامی تحاریک اور اسلامی ممالک خاص طور پر ترکی، الجزائر، افغانستان اور مصر میں اسلامی نظام حکومت کے نفاذ کی کوششوں اور پھر اسلامی قائدین اور اخوانی لیڈروں سید قطب شہید اور ان کے خاندان، امام حسن البناء اور دیگر گروہ مومنین پر مصری صدر ناصر کی حکومت نے جو ستم توڑے تھے۔ ادھر مشرقی پاکستان میں البدر اور الشمس کے کارکنوں اور اصحاب عزیمت لوگوں پر ہندو درندوں کے سفاکانہ مظالم سے اہل وطن کو باخبر رکھا جاتا تھا (ابھی تک موجودہ قصاب وزیر اعظم حسینہ واجد پاکستان سے محبت کے جرم میں پھانسیاں دے رہی ہے اور دنیا کے مسلمان حتیٰ کہ حکومت پاکستان بھی منقار زیر پر رکھے تماشا دیکھ رہی ہے اور محب وطن اصحاب علم و فضل حضرات کی پھانسیاں رکوانے کیلئے کوئی کارروائی نہیں کر رہی) اس زمانے میں پاکستان میں کوئی مذہبی یا سیاسی جماعت ایسی نہ تھی جسے کبھی بیرونی حالات سے کوئی دلچسپی رہی ہو بلکہ آگہی بھی ہو۔ اس کے برعکس ایک دفعہ جمعیت علمائے اسلام کے قائد مولانا مفتی محمود مرحوم نے صدر ناصر کی حمایت میں تقریر بھی کر ڈالی تھی۔۔۔ مودودی صاحب کی مخالفت میں۔۔۔ اس وقت پتہ چلا کہ تعصب کیا ہوتا ہے۔۔۔ جو مودودی صاحب کہیں اس کا الٹ۔۔۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔

صابرہ شتیلا کیمپس کا کہانی

"صابرہ" بیروت کے ایک غریب علاقے کا نام تھا۔ اس کے نزدیک ہی شتیلا نام کا ایک مہاجر کیمپ تھا، جس میں اسرائیلیوں کے ظلم و ستم کے ستائے ہوئے دربدر پھرنے والے فلسطینی مہاجرین پناہ گزین تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہ دونوں آبادیاں آپس میں اس قدر مدغم ہوگئیں کہ اس علاقے کو صابرہ اور شتیلا کہا جانے لگا۔ جب لبنان اندرونی خانہ جنگی میں علاقائی اور عالمی طاقتوں کا میدان جنگ بنا تو اسرائیلی افواج لبنان میں گھس آئیں۔ جنوبی لبنان پر قبضے کے بعد 1982 میں وزیر دفاع ایریل شیرون کی قیادت میں اسرائیلی افواج نے بیروت کا محاصرہ کر لیا اور فلسطینی لبریشن آرگنائزیشن (PLO) جس کی قیادت یاسر عرفات (مرحوم) کرتے تھے، سے کہا گیا کہ وہ اپنے مراکز بیروت سے ختم کرکے کہیں اور چلے جائیں۔ یکم ستمبر 1982 کو یاسر عرفات کے تمام ساتھیوں کو بیروت سے بے دخل کر دیا گیا۔ PLO کے مکمل انخلا کے بعد اسرائیلی کمانڈر ایریل شیرون نے فلانجی عیسائیوں کی تنظیم کے رہنما ایلی ہوبیکا کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ صابرہ شتیلا کے فلسطینی کیمپوں میں گھس کر نہتے فلسطینیوں کے قتل عام کی قیادت کرے۔ چنانچہ ایلی ہوبیکا نے ان مظلوم عورتوں بچوں مردوں اور بوڑھوں کو 16 ستمبر کی شام سے 18 ستمبر کی صبح تک مسلسل گھروں سے نکال کر قتل کرنے کے مختلف حربے استعمال کیے۔ اس اجتماعی قتل عام کے منصوبے میں تین ہزار کے قریب نہتے فلسطینی شہید ہوئے۔ اور 50ہزار فلسطینی اپاہج بن کر بقیہ زندگی گزارنے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کیلئے چھوڑ دیے گئے۔ اس دوران میں ایریل شیرون صابرہ شتیلا سے چند قدم دور کویت کے سفارتخانے کے قریب ایک زیر تعمیر عمارت کی تیسری منزل پر دوربین سے قتل عام کی نگرانی کرتا رہا۔ برطانیہ کے معروف دانشور رابرٹ فسک وہ پہلے صحافی تھے جنہوں نے اس دردناک قتل عام کو موقع پر رپورٹ کیا۔ ایریل شیرون نے صابرہ شتیلا کے کیمپوں میں مقیم فلسطینیوں پر انتہائی گھناؤنے مظالم کیے۔ یہودی لوگ ایریل شیرون کی اس سفاکیت کی مذمت اور انسداد کرنے کی بجائے اسے بڑے فخر کے ساتھ یہودیوں کا قصاب قرار دیتے رہے۔ اسرائیل نے اپنے قیام کے بعد سے معصوم فلسطینیوں پر مظالم کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ آج تک جاری ہے اور عرب لیگ اقوام متحدہ اور مغربی دنیا کے حکمران بے حسی کی چادر اوڑھ پر سو رہے ہیں۔ مسلم دنیا کی خاموشی اور عرب ممالک کا مصلحت آمیز رویہ اسرائیل کو مزید حوصلہ بخش رہا ہے۔

اسرائیل کا قیام۔۔۔ ظلم کی داستان

برطانوی سیاست نے جیسے برصغیر میں تقسیم کے وقت دھاندلی کر کے ہمیشہ کیلئے مسئلہ کشمیر پاکستان کیلئے سردردی کے لیے کھڑا کردیا، اسی طرح برطانیہ نے مشرق وسطی میں اسرائیل نام کے ناجائز بچے کی پیدائش و پرورش کے لیے اہل فلسطین کو ان کے اپنے وطن سے بے دخل کر کے ظلم و ستم کا بیج بو دیا ہے اور اب امریکی مجنون پاگل صدر ٹرمپ نے بیت المقدس کو اسرائیل کا دار الحکومت بنانے اور وہاں امریکی سفارتخانہ منتقل کرنے کا اعلان کر کے پاگل پن کا ثبوت بھی اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ مغربی دنیا کے پہلو میں دل نام کی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اگر کچھ ہے بھی تو اسلام دشمنی میں انسانیت کے خلاف سازشیں کرنے کا منبع ہی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے دنیا بھر سے یہودیوں کو لا لا کر فلسطین میں بسانا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ 1917 میں یہودی آبادی جو صرف 25 ہزار تھی وہ پانچ سال میں بڑھ کر 38 ہزار کے قریب ہو گئی۔ 1922ء سے 1939ء تک ان کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ جنگ عظیم دوم کے زمانے میں ہٹلر کے مظالم سے بھاگنے والے یہودی ہر قانونی اور غیر قانونی طریقے سے بے تحاشہ فلسطین میں داخل ہونے لگے۔ صیہونی ایجنسی نے ان کو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں فلسطین میں گھسانا شروع کر دیا اور مسلح تنظیمیں قائم کر کے ان کی سرپرستی کی، جنہوں نے ہر طرف مار دھاڑ کر کے عربوں کو بھگانے اور یہودیوں کو ان کی جگہ بسانے میں سفاکی کی حد کر دی۔

اب ان کی خواہش تھی کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن کی بجائے ان کی قومی ریاست کا درجہ حاصل ہو جائے۔ 1947 میں برطانوی حکومت نے فلسطین کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کو یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ اس کے حق میں 33 ووٹ اور اس کے خلاف 31 ووٹ تھے۔ دس ملکوں نے کوئی ووٹ نہیں دیا۔ تقسیم کی تجویز کی رو سے فلسطین کا 55 فیصد رقبہ 33 فیصد یہودی آبادی کو اور 45 فیصد رقبہ 67 فیصد عرب آبادی کو دیا گیا حالانکہ اس وقت فلسطین کا صرف 6 فیصد حصہ یہودیوں کے قبضے میں آیا تھا۔ یہودی اس تقسیم سے بھی راضی نہ ہوئے اور انہوں نے مار دھاڑ کر کے عربوں کو نکالنا اور ملک کے زیادہ سے زیادہ حصے پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ موجودہ دور کے صیہونی رہنما یہودیوں پر ہٹلر کے ذریعے ہونے والے مظالم کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ تا کہ اپنی سفاکی پر پردہ ڈال سکیں لیکن اس میں شک نہیں کہ یہودی خود فلسطینیوں کو ان کے اپنی سرزمین سے دربدر کر کے ان کی زمینوں پر قبضہ کرتے ہیں۔ نیز ان کے ساتھ وہی قتل و غارت گری کا معاملہ کرتے ہیں جو نازیوں نے یہودیوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ توسیع پسند و تسلط آزما اور طاقت کے نشے میں مدہوش مغربی دنیا کے ناجائز بچے اسرائیل نے 1967 میں عرب اسرائیل جنگ میں کامیابی کے بعد تمام فلسطین پر قبضہ کر لیا اور مقامی باشندوں کو بے دخل کر دیا۔ یوں اس سرزمین کے نسلا بعد نسل اصل وارث لاکھوں کی تعداد میں اردن، لبنان اور شام میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ مسجد اقصی میں ان مظلوموں میں سے بچ کر آنے والوں کیلئے کیمپ قائم کیے گئے تھے۔ جہاں بطور یادگار "صابرہ شتیلا کیمپ" نام رکھا ہوا ہے۔ جسے دیکھ کر ان درندوں کی سفاکیت ذہن میں کلبلانے لگ جاتی ہے۔ بہر حال صابرہ شتیلا کے یہ نام میرے ذہن پر چپکے ہوئے تھے۔ کافی دیر محویت کے عالم میں وہاں کھڑا رہا۔ پھر ساتھیوں کو اس کی مختصر تاریخ بتائی جتنی میرے ذہن میں تھی اور ان گمنام شہداء کے قافلہ سالاران شہادت و عزیمت کو سلام محبت و عقیدت بھیجا۔ ان کیلئے دعائے مغفرت کی اور بوجھل قدموں کے ساتھ آگے چل پڑے۔

مسجد اقصیٰ میں مدارس کا قیام

ان کیمپوں کے آثار کے عقب میں نشیبی علاقوں میں کئی مدارس کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ کیونکہ مسجد کی تصویر اس وقت تک مکمل ہی نہیں ہوتی جب تک اس میں تعلیمی و تدریسی کلاسز کا اہتمام نہ ہو۔ چونکہ مسجد اقصیٰ کی تاریخ بہت پرانی ہے اس لیے اس میں بھی کئی قسم کے مدارس بنائے گئے تھے۔ صحن قبۃ الصخراء میں معدوم ہو جانے والے کئی مدارس کے نام موجود ہیں۔ اس جانب مدرسہ شرعیہ اور دار الحدیث کی عمارت بھی ہے۔ جہاں امام مسجد اقصیٰ الشیخ یوسف کی سرپرستی میں بچے بچیوں کا بہت بڑا مدرسہ ہے۔ جن سے اتوار کی شام ملاقات کا وعدہ ہے (اور پھر یہ موقع نہیں آسکا، تفصیل بعد میں) گولڈن گیٹ کے بالائی حصہ میں لجنۃ الزکاۃ کا بورڈ نظر آیا۔ اس قدس زکوۃ کمیٹی کے رکن الشیخ محمد رجبی بڑے سلجھے ہوئے عالم دین ہیں۔ یورپ سے جانے والوں کے لیے یہ بات ذہن میں رہے۔ اصحاب خیر مالی تعاون کرنا چاہیں تو اس آفس سے رابطہ کر سکتے ہیں یہ آفس فلسطینی مجبور و مقہور لوگوں کیلئے جائے پناہ بھی ہے۔ مانگنے والے تو ہر جگہ مل جائیں گے لیکن ایک باقاعدہ سسٹم کے تحت یہاں سے مستحق لوگوں تک مدد پہنچ سکتی ہے۔

مقام سلیمان علیہ السلام

صابرہ شتیلا کیمپ سے تھوڑا سا آگے چلیں تو گولڈن گیٹ آجاتا ہے اس کے قریب ایک قدیم عمارت ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا مقام یہی تھا۔ جہاں سے بیت المقدس تعمیر کراتے وقت اپنے ماتحت جنوں کی نگرانی کیا کرتے تھے (اس کا ذکر سورہ سبا کی آیت 14 میں بھی آیا ہے) وہیں مبینہ طور پر جنوں کیلئے قید خانہ بھی تھا، جہاں سرکش جنوں کو قید کیا جاتا تھا۔ واللہ اعلم۔ اس وقت اس کے ایک حصہ میں مدرسہ دارالحدیث قائم ہے۔ پھر ہم

باب اسباط کے پاس پہنچے جہاں اسرائیلی فوجی حسب دستور کھڑے تھے۔ کیونکہ یہ مسجد کا دروازہ ہے اور کچھ فاصلے تک دفاتر ہیں ، یہاں ایک چھوٹا سا باغیچہ ہے۔ غالباً یہاں اسرائیلی سیکیورٹی فورسز کے دفاتر ہیں۔ اس کے بعد یروشلم کی دیوار کا بہت بڑا گیٹ ہے۔ باب اسباط (Gate of the Tribes) اس کی تعمیر بھی 1539 میں ہوئی تھی۔ اسباط قبیلوں کو کہا جاتا ہے۔ سورہ بقرہ اور آل عمران میں "ویعقوب والاسباط" کا نام آتا ہے یعنی مختلف قبیلے تو یہ گیٹ شاید انہی کی طرف منسوب ہے۔ اس دروازے کے مشرقی حصہ کی فصیل سے متصل باب الرحمہ ہے اور مسلمانوں کا قدیمی قبرستان بھی ہے۔

اقصیٰ کے پڑوس میں دائمی آرام فرمانے والے

ہم مسجد اقصیٰ کے باب اسباط سے نکلتے ہوئے دائیں جانب مڑے تو قبرستان کے گیٹ پر نظر پڑی۔ گیٹ کے دونوں طرف کافی تعداد میں یہاں دفن ہونے لوگوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر نوجوان شہداء کے اسماء گرامی ہیں، جو غالباً اسرائیلیوں کے ساتھ کسی نہ کسی جھڑپ میں اللہ کی راہ کے مسافر بن گئے تھے۔ ہم نہایت ادب کیساتھ دعاء پڑھتے ہوئے اس قبرستان میں داخل ہوئے۔ اس قبرستان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہاں کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، علماء و صلحاء کے علاوہ آزادی فلسطین کے نوجوان مجاہدین سمیت ان گنت سعید روحیں آرام فرمارہی ہیں۔ یہ سعید روحیں اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہیں کہ انہیں سرزمین انبیاء اور قبلہ اول مسجد اقصیٰ کا پڑوس نصیب ہوا۔ بائیں طرف سنہری گیٹ ہے جو بند ہے۔ روایات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل کرنے کے بعد اس دروازے سے مسجد اقصیٰ میں داخل ہوں گے۔ اس مناسبت سے کئی مسیح پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جیسے ہندوستان میں مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی مسیح موعود ہونے کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا۔ اس لیے اس گیٹ کو مستقل بند کرنا ہی مناسب سمجھا گیا۔ اس گیٹ کے قریب تیر کانشان بتارہا ہے کہ یہاں میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثار محو استراحت ہیں یعنی معروف صحابی حضرت عبادہ بن قیس رضی اللہ عنہ جو ہجرت سے قبل مدینہ سے مکہ آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں سے تھے اور بدری صحابی حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ، حضرت اوس بن شداد رضی اللہ عنہ، ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے علاوہ تقریباً 80 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس قبرستان میں محو استراحت ہیں۔ جامع عکاشہ میں حضرت عکاشہ بن محسن ، جبل زیتون پر حضرت رابعہ بصری اور دوسرے سرے میں حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ حضرت راحیل کی قبر بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے بعض کی قبریں پختہ ہیں۔ ان کے علاوہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں کہ کتنی اہم شخصیات یہاں مدفون ہیں۔ بعض قبور پر نام بھی لکھے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کی نشاندھی ہو جاتی ہیں۔ قدس کا ایک بڑا قبرستان "مامِلا" میں ہے۔ یہاں دور فاروقی میں معرکہ یروشلم کے شہداء سے لے کر پچھلی صدی کے اوائل تک تدفین ہوتی رہی۔ بیت المقدس کی مغربی دیوار کے قریب ہندوستان کے بڑے جید حریت رہنما مولانا محمد علی جوہر مرحوم اور اردن کے حسینی خاندان کے کئی افراد محو استراحت ہیں۔ مصر اور دیگر عربی ممالک کے کافی لوگوں کی قبریں بھی اس حصے میں نظر آئیں۔ اکثر قبور پر مرحومین کے نام ، تاریخ وفات اور ملک کا نام لکھا ہوا تھا اور فاتحہ پڑھنے کی درخواست کی گئی۔ ویسے مناسب تو یہ ہے کہ فاتحہ پڑھنے کی بجائے دعائے مغفرت کی درخواست کی جانی چاہیئے۔ ہم نے مسلم قبرستان کے تمام مدفونین کے لیے دعائے مغفرت کی کہ اللہ سب مرحومین کو بشری لغزشوں سے درگزر فرماتے ہوئے ان سب کو جنت الفردوس کا اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

اس علاقے میں ایک لاکھ چوالیس ہزار انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے ان میں سے بیشتر کی قبور اسی ایریا میں ہوں گی۔ حضرت داؤد ، حضرت زکریا، حضرت مریم علیہم السلام کی قبور کی نشاندھی تو کی جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی زوجہ حضرت سارہ، حضرت ایوب علیہ السلام ، حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی ایک اہلیہ کی قبر الخلیل میں ہے اور حضرت یوسف کی والدہ حضرت راحیل کی قبر جبل زیتون کے قریبی قبرستان میں ہے۔ سعودی علماء نے جنت البقیع کی سب پختہ قبریں کچی بنانے کا فتوی تو دے دیا لیکن ان کے اوپر مدفون ہستیوں کے نام تک نہیں لکھنے دیے۔ جس کی وجہ سے ان بے شمار پاک باز ہستیوں کے نام معلوم نہیں ہوسکتے جو جنت البقیع یا مکہ مکرمہ کے قبرستان جنت المعلیٰ میں محو استراحت ہیں۔ کہاں سے وہ لوگ ڈھونڈے جائیں جو ان سے نام بنام واقف ہوں اور وہ ہر زائر کو بتا سکیں۔ اب تو لگتا ہے کہ معدودے چند اصحاب وہاں مدفون ہیں۔ حالانکہ کم و بیش دس ہزار اصحاب نبی ، اصحاب جنت ۔۔۔ جنت البقیع میں دفن ہیں (رضی اللہ عنہم) علمائے سعودیہ نے اجتہاد کرنے کی بجائے صرف ایک نقطہ نظر سے فتویٰ جاری فرما دیا جسے بعض لوگ وقت کی ضرورت قرار دیتے ہیں اور بعض افراط و تفریط کے ضمن میں سمجھتے ہیں۔ اس قبرستان کے بائیں جانب جبل زیتون نظر آ رہا ہے جہاں سے یہودیوں کی قبریں بھی نظر آ رہی تھیں اور بالکل نیچے عیسائیوں کا قبرستان ہے۔ ہم نے رفقاء سفر کو یہودی اور عیسائی قبرستان دکھائے گئے۔ جس کے بعد ہم قبرستان سے باہر نکل آئے۔

حضرت مریم علیہا السلام کی مبینہ قبر

مسلم قبرستان کے نشیبی حصہ میں ایک چرچ ہے، جسے کنیسہ مریم عذرا کا نام دیا گیا ہے۔ کنیسۃ مریم عذرا باب اسباط سے کنیسۃ القیامۃ تک چودہ مقامات ہیں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بقول عیسائیوں کے صلیب اٹھوا کر چلایا گیا تھا لیکن اسلام کے مطابق

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کوئی گزند نہیں پہنچائی جاسکی۔ حق تعالیٰ نے اس سازش کے موقع پر کسی اور پر مشابہت ڈال کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمانوں کی طرف اٹھالیا تھا۔(سورہ المائدہ آیت نمبر 157-158) شاید یہاں بھی ان کے ہم شکل کو چلایا گیا ہو گا۔ مشہور ہے کہ اس چرچ میں حضرت مریم اور ان کے والدین کی قبریں ہیں، ہم وہاں داخل ہوئے۔ سیڑھیوں کے ذریعے کافی نیچے اترنا پڑتا ہے۔کافی نیچے ہونے کی وجہ سے اندھیرا اور موم بتیوں کے مسلسل جلنے سے وہاں گھٹن کا ماحول بنا ہوتا ہے، کہاں اسلام کی مساجد پاک و طاہر اور سادگی وپرکاری اور عبادت گاہ کا تقدس اور جلال و جمال کے محسوس و غیر محسوس مظاہر اور کہاں کلیساؤں کی نور و روحانیت سے محروم ڈپلومیٹ عمارتیں۔ پھر بھی یہ لوگ نہیں سمجھتے۔ وہاں دائیں طرف ایک چھوٹے سے کیبن میں حضرت مریم کی قبر بتائی جاتی ہے، جہاں بیک وقت دو یا تین آدمی داخل ہوسکتے ہیں، یہ قبر جو دودھ جیسے سفید پتھر میں گڑی ہوئی ایک ناہموار ٹیلے کی شکل میں موجود ہے۔ جس کے اوپر مضبوط شیشے کا بکس ہے، ہم سب ایک ایک کر کے وہاں داخل ہوئے سیدہ مریم صلوات اللہ وسلامہ علیہا کی روح مبارکہ کیلئے سلام پڑھا اور جلدی جلدی باہر نکل آئے کیونکہ وہاں کھڑا ہونا کافی مشکل نظر آیا ایک تو جگہ تنگ اور دوسرے ماحول بڑا گھٹن والا۔ اگر یہ قبور حقیقی ہوتیں تو وہاں روحانی سکون ہوتا لگتا ہے۔ بس روایات ہی ہیں جو نسل در نسل چلی آرہی ہیں حقیقت کا علم اللہ ہی بہتر جانتاہے۔اسی چرچ میں کچھ اور تاریخی چیزیں بھی موجود تھیں۔مگر ماحول کی تنگی اور ریسپشن پر بیٹھی ہوئی خاتون کا کرخت رویہ۔۔ میں اس سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ شاید بیچاری تھکی ہوئی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئے۔ چرچ کی عمارت کے ساتھ ایک چھوٹا سا باغ ہے، جہاں زیتون کے بے شمار درخت ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض کی جڑیں ہزاروں سال پرانی ہیں۔باہر نکلے تو واپسی والی چڑھائی بہت زیادہ نظر آئی۔ ویسے بھی پچھلے دو گھنٹے سے ہم مسلسل چل پھر رہے تھے۔اس لیے ایک ٹیکسی رکوائی اور فلسطینی نوجوان کو ڈائریکشن سمجھائی، اس نے تیس شیکل مانگے۔ ہم بیٹھ گئے اس نے فون پر جگہ کا پتہ کیا۔ اسے بتایا گیا کہ المسعودی محلہ میں ہے، تو بھاؤ تاؤ کرنے لگا، میں نے کہا۔ یا اخی، جتنے مانگو گے دیں گے۔ ہم تو ویسے بھی اپنے فلسطینی بھائیوں سے محبت کرتے ہیں۔ بہرحال پانچ منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہم اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ عصر تک آرام کیا اور پھر حسب معمول مغرب وعشاء کی نماز کیلئے دوبارہ مسجد اقصیٰ روانہ ہوگئے اور مغرب پڑھ کر مسجد اقصیٰ ہی کے باب السلسلہ میں واقع بی بی مریم (جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں) ان کے گھر چلے گئے۔ کچھ دیر وہاں ٹھہرے چھوٹا اور تنگ سا مکان تھا۔ جس کی کھڑکی مسجد اقصی کی جانب کھلتی ہیں۔ جس میں وہ بچوں سمیت رہ رہی ہے۔ ان کے احوال کے پیش نظر مہمان نوازی کی ساری پیشکشیں ہم نے قبول نہ کیں کہ باوضو رہنا زیادہ پسندیدہ بات ہے۔ ہماری خواتین نے ان کے خاندانی احوال پوچھے جنہیں سن کر بڑا کرب محسوس ہوا اور ان کی دلیری و شجاعت اور قناعت ایک مثال ہے، باپ اور بھائی مسجد اقصی کے محافظین میں سے تھے۔وہ شہید کر دیے گئے اور خاوند ایک زمانے سے گم ہیں یا کسی اسرائیلی زنداں میں قید اور یہ صابرہ وشاکرہ خاتون اپنے بچوں پر شفقت مادری کے پر پھیلائے سایہ فگن ہے، مختلف قسم کے کام کر کے اپنے بچوں کو پال رہی ہے، جبکہ آئے دن مسجد اقصی بند کر دی جاتی ہے اور بعض دفعہ سپیشل پاس ہونے کے باوجود انہیں مسجد اقصیٰ کے دروازے بھی ان پر بند کر دیے جاتے ہیں۔16/ جولائی کو جب مسجد اقصیٰ میں اسرائیلی فوجیوں نے فائرنگ کر کے تین فلسطینی نوجوانوں کو شہید کر کے مسجد اقصیٰ بند کر دی تھی۔ تو مریم بی بی بھی اپنے ہی گھر میں قید ہو کر رہ گئی، انہوں نے بتایا تھا کہ اسرائیلیوں نے انہیں وارننگ دی تھی کہ تم نے مسجد اقصیٰ کی جانب پردے ڈال کر رکھنے ہیں۔ جھانکا بھی تو گولی ماردیں گے۔ اسی دوران میں ان کی ایک ہمسائی بھی آگئی تھیں ان کی کہانی بھی وہی تھی، بلکہ مسجد اقصیٰ کے اندرونی حجروں میں مقیم سارے خاندان اسی کرب سے گزر رہے ہیں اس سب کے باوجود وہ بہت خوش ہیں اور اپنے آپ کو سعادتمند سمجھتے ہیں جنہیں مسجد اقصی میں مکان ملا ہے۔ ان کے بقول اسرائیلی ان تنگ و تاریک مکانوں کی منہ مانگی قیمت دینے کیلئے تیار ہے۔وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْن۔ میں نے کہا اختی آپ کے اسی حجرے کا قرآن میں ذکر آیا ہے۔ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ۔۔ اس مناسبت کو سمجھ گئیں اور... تھوڑی سی ریلیکس ہو گئیں، ہم ان کیلئے جو تحائف لے کر گئے تھے ان کی خدمت میں پیش کیے اور اجازت لے کر رخصت ہوئے۔ واپسی دمشقی دروازے سے ہوئے۔ یہاں یہودیوں کی بہت زیادہ آمد و رفت جاری تھی۔

متفرق مقدمات

درج ذیل مقدمات مختلف مقامات پر دائر ہو کر اہلحدیث کے حق میں فیصل ہوئے:

دہلی ۔ عدالت کمشنری ۔ سنہ فیصلہ 1883ء ۔ منجانب اہل حدیث دائر ہوا۔

دہلی۔عدالت دیوانی۔سنہ فیصلہ 1883ء۔ منجانب احناف دائر ہوا۔

نصیر آباد ضلع اجمیر۔عدالت فوجداری۔سن فیصلہ 1884ء منجانب اہل حدیث دائر ہوا۔

میرٹھ۔عدالت منصفی۔سن فیصلہ 1886ء۔ من جانب اہل حدیث دائر ہوا۔

علی گڈھ، کول۔عدالت ججی۔سنہ فیصلہ 1899ء منجانب اہل حدیث دائر ہوا۔

آرہ۔عدالت ججی۔سنہ فیصلہ 1893ء منجانب اہل حدیث دائر ہوا۔

شہر غازی پور ۔ عدالت فوجداری ۔ سنہ فیصلہ 1894ء من جانب اہل حدیث دائر ہوا۔

ضلع غازی پور ۔ عدالت منصفی ۔ سنہ 1895ء۔ منجانب اہل حدیث دائر ہوا۔

ایلور مدراس، عدالت منصفی۔1895ء من جانب اہل حدیث دائر ہوا۔

بلہاری مدراس ۔ عدالت فوجداری۔ سنہ فیصلہ 1896ء من جانب اہل حدیث دائر ہوا۔

بنارس ۔ عدالت منصفی ۔ سنہ فیصلہ 1896ء ۔ منجانب اہل حدیث دائر ہوا۔

مادھو پور، جے پور ۔ عدالت فوجداری ۔ سنہ 1896ء من جانب اہل حدیث دائر ہوا۔

شہر پٹنہ ۔ عدالت ججی ۔ سنہ فیصلہ 1897ء من جانب احناف دائر ہوا۔

دومراؤ ضلع آرہ ۔ عدالت منصفی ۔ سنہ فیصلہ 1897ء۔ من جانب احناف دائر ہوا۔

کیکڑی ضلع اجمیر ۔ عدالت فوجداری۔ سنہ فیصلہ 1905ء۔ من جانب اہل حدیث دائر ہوا۔

جودھپور مارواڑ ۔ محکمہ عالیہ خاص۔ سنہ فیصلہ 1902ء۔ من جانب اہل حدیث دائر ہوا۔

جودھپور مارواڑ ۔ عدالت فوجداری ۔ سنہ فیصلہ 1903ء۔ من جانب احناف دائر ہوا۔

ریاست جے پور۔ محکمہ اپیل۔ سنہ فیصلہ 1910ء۔ من جانب اہل حدیث دائر ہوا

مادھو پور علاقہ جے پور۔ عدالت اپیل سنہ فیصلہ 1911ء۔ من جانب احناف دائر ہوا۔

کھنڈیلہ علاقہ جے پور۔ عدالت اپیل۔ سنہ فیصلہ 1911ء۔ من جانب اہل حدیث دائر ہوا۔

ریاست جے پور محکمہ عالیہ کونسل جے پور خاص۔ سنہ فیصلہ 1912ء من جانب احناف دائر ہوا۔

کڈپہ، مدراس ۔ عدالت فوجداری ۔ سنہ فیصلہ 1912ء۔ من جانب احناف دائر ہوا

چھاؤنی انبالہ ۔ محکمہ اپیل ۔ سنہ فیصلہ 1912ء۔ من جانب اہل حدیث دائر ہوا۔

رتن پور ضلع مراد آباد۔ عدالت دیوانی۔ سنہ فیصلہ 1912ء۔ من جانب احناف دائر ہوا۔

کوٹہ راجپوتانہ ۔ محکمہ عالیہ خاص۔ سنہ فیصلہ 1912ء۔ من جانب اہل حدیث دائر ہوا۔

سرواڑ علاقہ کشن گڈھ ۔ محکمہ عالیہ خاص ۔ سنہ فیصلہ 1912ء۔ من جانب اہل حدیث دائر ہوا۔

آگرہ۔ عدالت منصفی۔ سنہ فیصلہ 1904ء ۔ من جانب اہل حدیث دائر ہوا۔

یہ فہرست جناب عبدالمجید (مدرسہ اسلامیہ چوراہہ نائی منڈی شہر آگرہ) نے شائع کی تھی۔ پھر مسلم اہل حدیث گزٹ دہلی ج 1 شمارہ 8 ۔ اپریل 1934ء کے صفحہ 7 پر نقل ہوئی جہاں سے مناسب ترمیم کے بعد یہاں نقل کی گئی ہے۔

(صفحات ذیل میں بعض مقدمات کے عدالتی فیصلہ جات کا اصل انگریزی متن انڈین لاء رپورٹس سے نقل کیا جاتا ہے۔ بہاء)۔

Full Bench

Present: Sir W. Comer Petheram, Kt., Chief Justice, Mr. Justice Straight, Mr Justice Oldfield, Mr. Justice Brodhurst, and Mr Justice Mahmood

Queen-Empress v. Ramzan and Others

7th March 1885

Ramzan, Muhammad Husain and Abdul Rahman were convicted by Cantonment Magistrate of Benares, of an offence under S. 296 Indian Penal Code. His judgment was as follows-:

"The particulars of this case are as follows-:

In muhalla Maddanpura, City Benares, a large masjid exists, generally called Allu's masjid, after the builder. Abdullah, the complainant, was left in charge of this masjid after Allu's death, some years ago, and Ramzan, accused, is a grand-nephew of Allu's, and is also

has Ramzan come to the masjid, never before. Be that as it may, Ramzan and his companions, the two other accused, have not a shadow of an excuse for disturbing the people in the masjid. It is useless to inquire whether it is lawful or not to use the word amin. As long as by doing so the accused disturbed the assembly, they rendered themselves liable to punishment under S. 296, Indian Penal Code. If it be true that the enmilty between Ramzan and Abdullah originated in a quarrel about the income of the masjid, his conduct is all the more resprehensible, for he has disturbed a large number of persons engaged in prayer, merely to gratify his spite against an individual. The Courts of Law are the proper places to settle money quarrels, and not places of religious worship, and it is intolerable that men like the accused should be allowed to cause annoyance to a whole community.

"The Court is of opinion that Ramzan, son of Maddar, Muhammad Husain, son of Allahdin, and Abdul Rahman, son of Abdul Karim, are guilty of the charge preferred against them, viz., that they voluntarily disturbed an assembly engaged in religious worship, thereby committing an offence punishable under S. 296, Indian Penal Code; and the court directs that the said when giving evidence. They consider the presence of Ramzan and his companions not desirable in the masjid, but raise no objection to their joining the worshippers as long as they cause no disturbance. Ramzan states that there is enmity between him and Abdullah on account of the masjid accounts, and that therefore he was turned out of it on pretence of his saying amin loudly, which is not objectionable to the Hanafis, the real reason being that Abdullah will not give him a statement of the masjid's income, also that he has always prayed at the masjid. The other two accused say, that on 22nd August 1884, they saw Ramzan being beaten and interfered with, on which Abdullah and his party have included them in the charge brought against Ramzan. The witness for the defence merely state that they consider that calling out amin loudly does not disturb an assembly at prayers, and yet they all state that they only speak the word very low themselves. They also speak to the quarrel having originated in money matters about repair to the masjid, and further, that the three accused have frequented this mosque for years. I note, however, that the only independent witness, a Hindu named Harpal, who keeps a shop under the masjid, states that he has been there for five years, and that only within the last month his son-in-law. During the month of August 1884, Ramzan, who it seems, had not frequented this mosque for many years, suddenly returned to it. He was accompanied by Muhammad Husain, accused, and Abdul Rahman, accused, and these three men at once began a series of annoyances to the assembly engaged in prayer in the masjid. The men who use the masjid nearly all belong to a sect called Hanafis, and Ramzan also formerly belonged to it, but has lately become a Wahabi. It appears the Hanafis use the word amin in their prayers, but say it so low that only a person standing very close can hear it. The Wahabis, on the contrary, call out amin at the top of their voices, and by doing so in the Allu's masjid the three accused naturally disturbed the Hanafis engaged in prayer. The evidence for the prosecution is perfectly clear, first as to the fact of the three accused having entered the masjid on four successive Fridays during August and September; secondly, as to having by their behaviour disturbed the assembly at prayers; and thirdly, as to police intervention being necessary, on the 22nd August 1884, to quell a disturbance occasioned by the accused, and which threatened to become serious. The witnesses are respectable persons, and most moderate in the views they express

consisting of several judges, hears a case, no judgement or order can be legally passed until all those Judges have conferred with each other and made up their minds together. Upon this occasion, however, I must submit to the view of the majority of the Bench; but I regret, as I said before, that I am not in a position to make any order in this case, and must, ex necessitate, reserve my judgement or order till the exigencies of the business of the Court leave me time to form a definite opinion on this case, which, considering that none of the accused is undergoing the sentence of imprisonment, does not seem to me to be one of any especially emergent urgency.

On the 14th March the following opinion was delivered by Mahmood, J. on the question referred to the Full Bench.

Mahmood, J-.

This case originally came on for hearing in the single Bench before my brother Brodhurst, and, in view of the peculiarities of the question with regard to the right of worshipping in mosques possessed by Muhammadan, my learned brother referred the case to a Division Bench, of which, at his suggestion, and with the approval of the learned Chief justice, I was to be a member. The case was accordingly heard by a Bench consisting of my brother not upon the record sufficient evidence to justify a conviction.

Oldfield, J-.

I am of the same opinion.

Brodhurst, J-.

I am of the same opinion.

Mahmood, J-

In this case I regret I am not able to concur in, or dissent from, the proposed order, because I have not yet been able to form any definite opinion. Under such circumstances, and considering that I am one of the Judges constituting this Bench, I should have thought that the judgement or order of the Court would, according to the ordinary judicial usage and practice, be reserved till I had an opportunity of forming an opinion in the case, and of placing my views before my honourable colleagues. But upon this point I have been overruled by the learned Chief Justice and my learned brethren, and I must therefore defer to their view, though I confess- and I say this with profound respect- that the order of the majority of the Court seems to me to be, under circumstances, one of the doubtful legality. In a recent case- The Rohilkhand and Kumaun Bank v. Row - I had the opportunity of expressing my views, in which the rest of the Bench concurred, to the effect that it is an essential principle of judicial acts, that when a Court, Ramzan, Muhammad Husain, and Abdul Rahman, pay a fine of twenty-five rupees each, or in default, be rigorously imprisoned for one month".

Hence this application to the High Court for revision.

Reference to the Full Bench

The following question was referred to the Full Bench-:

"Whether the facts proved in this case amount to an offence under S. 296 of the Indian Penal Code"?

Judgement of the Full Bench

Petheram, C.J-

Speaking for myself only, the order which I propose to pass in this case, that the case be re-tried by the Magistrate, and that in retrying it he should have regard to the following questions-:

1. Was there an assembly lawfully engaged in performance of religious worship?

2.Was such assembly in fact disturbed by Ramzan?

.3Was such disturbance caused by acts and conduct on the part of Ramzan by which he intended to cause such disturbance, or which acts and conduct, at the time of such acts and conduct, he knew or believed to be likely to cause such disturbance?

Straight, J-.

I consent to the proposed order, though speaking for myself alone, I am not prepared to say that there is

otherwise related to him. The other two accused, Muhammad Husain and Abdul Rahman, are persons holding religious views similar to those held by Ramzan.

It appears that on the 22nd of August, 1884, the three accused joined the congregation in the mosque, and during the prayer said the word amin aloud. This appears to have led to a discussion as to whether it was right to say the word aloud in prayer, and a heated argument took place, resulting in the accused being turned out of the mosque with the help of the police, and the prosecutor prohibiting them from coming to the mosque again unless they renounced the rite of saying amin aloud in mosque.

On the 1st of September 1884, Abdullah and some other persons presented an application to the Magistrate, describing the occurrences of the 22nd August, and asking for interference of the Magisterial authorities on the ground that breach of peace was likely to take place by reason of the accused insisting upon saying the word amin aloud in prayers. No definite action appears to have been taken by the magisterial authorities on that application beyond sending it for inquiry to the City Inspector of Police, and matters seemed to have stood thus, when, on 20th of September 1884, Abdullah by the evidence on the record was sufficient to justify the conviction. I was, however, unfortunately not able to concur in, or dissent from, the order for single reason that I had formed no definite opinion in the absence of the authorities of the Muhammadan Law, which had not been cited on either side.

Under these circumstances, it has devolved upon me now to deliver my judgement in the case, and I regret that the conclusion at which I have arrived is different from that at which the learned Chief Justice and the rest of the Court have done. In view of this circumstance and also because facts similar to those that exist in this case have before now been made the subject of a criminal prosecutions in cases which have ultimately come up to this court in revision, I wish to explain my reasons fully.

The facts of the case itself are very simple. The mosque in question in this case is situate in muhalla Maddanpura, in the city of Benares, and it was built by one Ali Muhammad alis Allu, who is stated by the prosecution to have followed the doctrine of Imam Abu Hanifa, and was therefore a Hanafi. The prosecutor, Abdullah, is a brother-in-law of the founder of the mosque, his sister having been married to Allu, and principal accused, Ramzan, is the son-in-law of Allu, and also Oldfield and myself, and, in consideration of the fact that the main object of the application for revision was to obtain an authoritative ruling upon the question, and also because the applicant's counsel informed us that the applicantsts, having paid the fine inflicted upon them, were not undergoing the alternative sentence of imprisonment, we referred the case to the Full Bench before which the case was re-arranged by Mr Amir-ud-Din on behalf of the applicants, and the learned Public Prosecutor on behalf of the Crown. Upon that occasion, after having fully heard the arguments on either side, I was unable to form any opinion such as could be made the basis of any order in the case, and being desirous of consulting the original authorities of Muhammadan law, I wished to reserve my order to enable me to prepare a judgment in writing, as the question raised by the refeerence seemed to me to be far from simple, specially, as in my opinion it turned upon a very minute point of the Muhammadan Ecclesiastical law. The learned Chief Justice and my learned brethren, however, were able on that occasion to form an opinion in the case, and make an order remanding the case for re-trial on certain issues. My brother Straight, whilst consenting to the order of re-trial, was inclined to the opinion that

entirely upon the correct interpretation of the rules of the civil law, cannot, in my opinion, be doubted; and if it is so, the present case is only another illustration of this principle. Indeed, I am prepared to go the length of saying that, but for this principle, the rules of the Penal Code would in many cases operate as a great injustice, and acts fully justified by the civil law would constitute offences under that Code. I hold therefore that in a case like the present, the provisions of S. 36 of the Evidence Act fully relieve the parties from the necessity of proving the Muhammadan Ecclesiastical Law upon the subject, that law is not to be placed upon the same footing with reference to this matter as any foreign law of which judicial notice cannot be taken by the Courts in British India; and it follows that I can refer to the Muhammadan Ecclesiastical Law for the purpose of this case, notwithstanding the absence of any specific evidence on the record regarding its rules.

Now before going further, I wish to observe that the main allegations on behalf of the prosecution, contained in the petition of the 14th September 1884, and in that of 24th September 1884 relate to the conduct of the accused in saying the word amin aloud during prayers in the mosque; that in the evidence for the prosecution itself the loud utterance Muhammadan Ecclesiastical Law in such cases without having the rules of the law proved by specific evidence like any other facts in Litigation. I am unable to accept this view, because, it is conceded that the decision of this case depends (as I shall presently endeavour to show it does depend) upon the interpretation of the Muhammadan Ecclesiastical Law, it is to my mind the duty of this Court and of all Courts subordinate to it, to take judicial notice of such law. I hold that Cl (1) of S. 37 of the Evidence Act (1 of 1872) fully covers the Muhammadan Ecclesiastical law in such cases, because, whenever a question of civil right or the lawfulness of an act arises in a judicial proceedings, even a Criminal Court is bound, ex necessitate, to resort to the civil branch of the law; and, in a case like the present, the question being the right of a Muhammadan to pray in a mosque according to his tenets, the question of legality or illegality would fall under the purview of the express guarantee given by the Legislature in S. 24 of the Bengal Civil Courts Act (V1 of 1871), that the Muhammadan Law shall be administered with reference to all questions regarding "any religious usage or institution". That the application of some of the sections of the Indian Penal Code depend almost himself filed another petition, complaining of the accused, and charging them with "the offence of insulting the religion of the Hanafia Musalmans" under S. 297, 298, 352 of the Indian Penal Code. The Magistrate, after having examined the prosecutor and the witnesses for the prosecution, framed charges against the accused under S. 296 of the Indian Penal Code, and after having taken the evidence on behalf of the defence, convicted them under that section, and sentenced them to pay a fine of Rs. 25 each, and in default, to undergo rigorous imprisonment for one month.

The accused have applied for revision to this Court under S. 439 of the Criminal Procedure Code, on the ground that "to pronounce the word amin in a loud tone during the prayers is not an offence punishable under S. 296 of the Indian Penal Code".

The question so raised seems to me to involve mixed consideration of the meaning of the Indian Penal Code and Muhammadan Ecclesiastical Law; for according to my view, the application of the former depends upon the interpretation of the latter in connection with this case. But before discussing this question, I wish to express my views with reference to the observation which was made in the course of the argument, that this Court is not bound to consider the

Muhammadanism, like other religions, is divided into various sects or schools of doctrines, differing from each other in matters of principle or in matters of detail as to the minor points of ritual. " The Musalmans who assume to themselves the distinction of orthodox, are such as maintain the most obvious interpretation of the Kuran and the obligatory force of tradition in opposition to the innovations of the sectaries, whence they are termed Sunnis or traditionists ...... and it is their opinion alone which is admitted to have any weight in the determination of jurisprudence." These four schools or sects, of which this concise account has been given by Mr Hamilton in the Preliminary Discourse of his translation of the Hedaya, were founded by the four orthodox Imams, namely, Abu Hanifa, Malik, Shafai, and (Ahmad bin) Hanbal, all of whom flourished within the first two centuries of the Muhammadan era, or eighth century of the Christian era. To use the language of Mr. Hamilton again-:

"The word orthodox as here used is confined purely to a justness of thinking in spiritual matters, concerning which opinions of those four sects perfectly coincide, the differences among them relating solely to their exposition of the temporal law". (Continue)

aloud in prayers is not an act which falls within the purview of S. 79 of the Indian Penal Code, which lays down the elementary proposition of the criminal law that "nothing is an offence which is done by any person who is justified by law, or who by reason of a mistake of the fact and not by reason of a mistake of law in good faith, believes himself to be justified by law in doing it".

The word amin is of Semitic origin, being used both in Arabic and Hebrew, and has been adopted in prayers by Muhammadans as much as by Christians. The word does not occur in the Koran, but, in conformity with the Sunna, or the practice of the Prophet, it is regarded by Muhammadans as an essential part of the prayers, as a word representing earnestness in devotion. The word is pronounced at the end of the first chapter of the Kuran, which consists the following prayers-:

"Praise be to God, the Lord of all creatures; the most Merciful; the king of the day of Judgement. Thee do we worship, and of Thee do we beg assistance. Direct us in the right way, in the way of those to whom Thou hast been gracious, not those against whom Thou art incensed, nor of those who go astray".

In order to understand the exact difficulty which has arisen in this case with reference to the word amin, it is necessary to bear in mind that of that word is the graramen of the accusation; that the Magistrate framed charges under S. 296, Indian Penal Code, with reference to that matter alone, disregarding the other section of the Indian Penal Code cited on behalf of the prosecution; and that his judgement entirely proceeds upon the view that the loud utterance of the word amin during prayers constitutes a criminal offence under the circumstances of this case. It is true that in the evidence for the prosecution there were vague allegations as to other facts which might possibly have furnished basis for charging the accused under some other sections of the Indian penal Code; but as a matter of fact, the Magistrate did not charge or try the accused under any other section, and at all events we in the Full Bench are not concerned with the whole case.

Holding these views, I feel myself called upon, sitting as a Judge in the Full Bench to which the reference has been made solely as to S. 296 of the Indian Penal Code, to consider the case for the purpose of answering the reference only in that aspect, leaving it to the referring Bench to decide questions which may possibly arise in the case beyond the scope of the question referred.

But before discussing the various elements of the offence described in the section, I think it necessary to consider whether the saying of amin

عید

اب کے دنیا میں عجب ڈھنگ سے عید آئی ہے
ہُو کا عالَم، اداسی کے ہیں ڈیرے ہر سُو
دیکھنے چاند کو نکلا نہ کوئی چاند کہیں
کوئی عیدی، نہ مٹھائی، نہ کھلونے، اے عید
منہ چھپائے ہوئے جو دُور سے کرتا ہے سلام
عید پر روٹھے ہوؤں سے بھی گلے ملتے تھے
ایسے کترا کے نکلتے ہیں گھروں سے جیسے
یوں ہے احباب سے کچھ شوقِ ملاقات کا حال
دبکے بیٹھے ہیں سبھی جیسے قفس میں بلبل
چار جانب تو ہے بے رنگ وبا کی آندھی
ساری دنیا میں کورونا ہی ہے موضوعِ خبر
مبتلا خوف میں ہے وہ جو ابھی ہے محفوظ
ہے دعا بھیج کسی عیسیٰ نفس کو یارب

کوئی تکبیر، نہ تہلیل و جبیں سائی ہے
وحشت و خوف کا ماحول ہے، تنہائی ہے
نہ کوئی زلف کسی بام پہ لہرائی ہے
نونہالوں کے لیے تحفے میں کیا لائی ہے؟
اجنبی سمجھا تھا جس کو وہ مرا بھائی ہے
اب کے پیاروں سے بھی دوری میں ہی دانائی ہے
اپنی دہلیز نہیں، کوچۂ رسوائی ہے
پیش قدمی میں تذبذب بھری پسپائی ہے
کوئی محفل، نہ کہیں انجمن آرائی ہے
سر پہ افلاس کی بھی سرخ گھٹا چھائی ہے
ساری دنیا میں ہر اک چیز کورونائی ہے
وہ بھی بیمار ہے جس جس نے شفا پائی ہے
خلق سب منتظر دستِ مسیحائی ہے

خواجہ محمد عارف، برمنگھم